بھیگی پلکوں کا بوجھ

ادیبِ شہیر :

حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری



بھیگی پلکوں کا بوجھ

از

ادیبِ شہیر

حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری

ناشر

شبیر برادرز۔ ۴۰ بی اردو بازار لاہور

نام کتاب ——— بھیگی پلکوں کا بوجھ

نام مصنف ——— محمد وارث جمال قادری

نام ناشر ——— شبیر برادرز۔ لاہور

نام کاتب ——— اعجاز احمد ساقی

تعداد اشاعت ——— چھ سو

سن اشاعت ——— ۱۹۹۳ء

نام مطبع ——— بک پرنٹرز لاہور

ہدیہ ——— [redacted]/ روپے

فہرست مضامین

ماخذ و مراجع

تاریخ طبری جلد دوم ——— حضرت امام جعفر ابن جریر الطبری ———
مکاشفۃ القلوب ——— حضرت امام غزالی ———
تذکرۃ الاولیاء ——— حضرت فرید الدین عطار ———
تذکرۃ المحدثین ——— مولانا غلام رسول فریدی ———
تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ——— پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود ایم اے، پی ایچ ڈی
سیر الاولیاء ——— خواجہ امیر خورد ———
نفحات الانس ——— علامہ عبدالرحمن جامی ———
سفینۃ الاولیاء ——— شہزادہ دارہ شکوہ ———
حیات الصوفیہ ——— محمد ادریس انصاری ———
امیر خسرو ——— ڈاکٹر وحید مرزا ———
آب کوثر ——— پروفیسر محمد اکرم ———
دلی کے بائیس خواجہ ——— ظہور الحسن شارب ———
سوانح حیات شیخ المشائخ ——— مولانا نسیم بستوی ———
حکایات شیریں ——— مدیر مجلہ آئینہ لاہور ———
خسرو شناسی ——— ڈاکٹر ظ انصاری و ابو الفیض سحر
ریاض الشعراء ——— علی قلی خاں یاغستانی ———

آغازِ سخن

زیرِ نظر کتاب "بھیگی پلکوں کا بوجھ" میری کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً میں نے اپنی تجارتی مصروفیات سے وقت بچا بچا کر بزبانِ حکایت لکھے۔ جو بحمدہٖ تعالیٰ ملک اور بیرونِ ملک کے مؤقر جرائد و رسائل اور ڈائجسٹوں میں شائع ہو کر قارئین سے بے پناہ پسندیدگی کا خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے کہیں بھی زیبِ داستان کے لیے ہرگز ہوا میں تیر نہیں چلایا بلکہ جو کچھ تحریر کیا ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر، اپنے ہر مضمون کے لیے میں نے پہلے مضبوط زمین تلاش کیا۔ پھر اس پر خاکے بنائے، پھر اس میں کمالِ دلسوزی و دیدہ ریزی سے رنگ بھرے۔ تب جا کر کہیں عشق و محبّت، حسن و عقیدت کا یہ سدا بہار گلدستہ تیار ہوا۔ اس طویل مسافت میں کچھ مقام ایسے بھی آئے جہاں پر خود میری پلکوں پہ بار بار آنسو لرزے سے

بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حالِ فقیرانہ کسی کا

کتاب کے آخر میں میں نے مآخذ و مراجع کی ایک فہرست بھی دیدی ہے۔ جس سے معلوم ہو گا کہ اس گلدستۂ نوبہار کی

لالہ کاری ہیں کتنے گلستانوں نے گل ریزی کی ہے تب جا کر کہیں صحن تمنا میں محبت کے اس طرح پھول کھلے، عقیدت کے چشمے جاری ہوئے، اور عشق و وجدان کی لطافتیں نئی لذت سے آشنا ہوئیں ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

جب میں نے اسے کتابی شکل دی تو ملک کے مؤقر کتب خانوں کی طرف سے اشاعت کی پیشکش ہوئی ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ انجمن رضائے مصطفےٰ بڑھیا کے زندہ دل جواں ہمت جواں حوصلہ ارکان نے اصرار کر کے مسودہ مجھ سے حاصل کر لیا ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ چونکہ اس انجمن کا ایک رکن میں بھی ہوں۔ اس لئے اور بھی مجھے انجمن کے ارکان کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اشاعتی محاذ پر یہ انجمن کا پہلا بڑا قدم ہے مولیٰ عزوجل اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل انجمن رضائے مصطفےٰ بڑھیا کے اراکین، اس کے ہمدردوں، بہی خواہوں اور اس سے محبت کرنے والوں کو دارین کی خوشیاں عطا فرمائے اور ان سے اسلام و سنیت کی زیادہ سے زیادہ خدمات لے۔

آمین بجاہ سید المرسلین

محمد وارث جمال قادری

۱۱ر شوال المکرم ۱۴۰۹ھ

مطابق ۱۶ر مئی ۱۹۸۹ء

انجمن رضائے مصطفیٰ!

یہ انجمن دراصل مدرسہ غوثیہ اہلِ سنّت فیض العلوم بڑھیا کا ایک ذیلی شعبہ ہے جس نے مختصر سی مدّت میں علاقائی طور پر مسلمانوں کے اندر دینی بیداری، ملّی تڑپ، اور تصلّب فی الدین کی لہر دوڑا دی۔ یوں تو مدرسۂ غوثیہ کو قائم ہوئے تقریباً چھبیس ۲۶ برس ہوئے ہیں۔ اور اس کے زیرِ اہتمام ایک انجمن تھی جو اپنی بساط کی حد تک طلبہ کے اصلاح و تربیت تک محدود تھی۔ پھر اس انجمن کو اسلام و سنیت کے ہمہ جہت خدمات کے لئے انجمن رضائے مصطفیٰ کی شکل دی گئی۔ جو . . . .

. . . . یادگارِ سلف حجۃ الخلف سند المحققین حضرت مولانا بدرُالدّین احمد قادری رضوی کی سرپرستی و نگرانی میں قائم ہوئی۔ شروع شروع میں فرزندان مدرسہ غوثیہ مولانا محمد عارف، مولانا سیّد افروز نوری، مولانا محمد شمیم قادری، مولانا محمد مستقیم خان محترم محمد وکیل بھگوت پوری، اور عزیز احمد خان نے بڑا کلیدی رول ادا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن کے حسن خدمات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اور اب تو پورے کارواں کا کارواں نے انجمن رضائے مصطفیٰ کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں بسالیا ہے سے

۸

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

عبدالصمد خاں، مولوی غلام محمد خاں، ابرار احمد دھوبی، مولینا عتیق الرحمٰن فیضی، محمد مقبول کیتھولیا، زاہد خاں، عدیل خاں، برادرم عتیق الرحمٰن صاحب وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے انجمن رضائے مصطفےٰ کو اپنی دینی ضرورت سمجھ کر اس کے وجود کی افادیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ اور جب بھی انجمن کو اُن کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اپنا کام کاج چھوڑ کر انجمن کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ انجمن رضائے مصطفےٰ بڑھیا کا ایک بڑا کارنامہ سال میں ایکبار عظیم پیمانے پر دو روزہ دینی اجلاس کا انعقاد ہے۔ یہ اجلاس بڑے تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بڑھیا کی سرزمین پر ہر چہار جانب سے انسانوں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ جن کے انتظام وانصرام اور میزبانی کا سارا بوجھ مدرسہ غوثیہ کے بجائے انجمن رضائے مصطفےٰ کے جواں حوصلہ ارکان کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ یہ اجلاس خالص دینی اور مذہبی ہوتے ہیں، سیاست حاضرہ کی آلودگیوں سے پاک اور مداہنت فی الدین سے کوسوں دور۔ اس میں نہ تو سیٹھوں کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے اور نہ صلح کلیوں کی دلجوئی۔ اور نہ ہی بدمذہبوں کی کوئی رو رعایت۔ اس تاریخی اجلاس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں چندہ کا کوئی دھندہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس میں کسی بدمذہب کی پذیرائی۔ خواہ وہ دُنیوی طور پر کتنا ہی بڑا صاحب اعزاز کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ فی زمانہ دیکھے جاتے

ہیں کہ زعم باطل اور اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا بعض معاصر

ادارے کا یہی دھندا ہے۔ ان کے جلسے کی غرض وغایت اشاعت اسلام وسنیت کم حصول زر مقصد زرّیں ہوتا ہے ؎

یاں دعاؤں کی فیس لگتی ہے

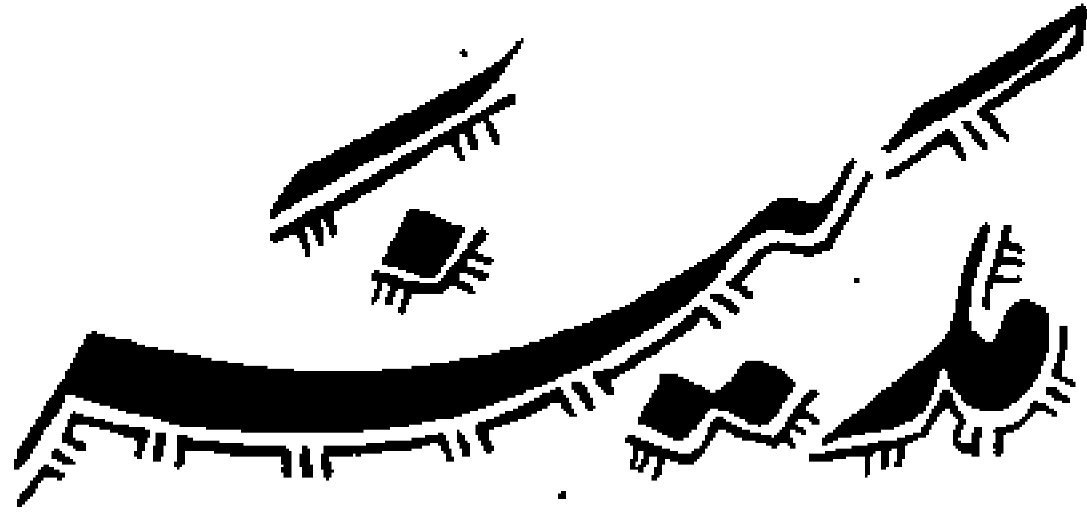
زر ملے تو زبان ہلتی ہے

اس کے لیے ہر وہ راستہ اختیار کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ اور اپنے زنبیل گدائی کی شکم پری کے لیے اپنے وقار، عزت نفس، حرمت سنیت، اور امتیاز حق و باطل، سب داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ مولیٰ عزوجل اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ایسے اداروں کے اساتذہ و ارباب بسط وکشاد کی تطہیر فرمائے اور ان کے قلوب کو عظمت اسلام وسنیت اور اخلاص فی الدین کے جذبوں سے بھر دے ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

محمد وارث جمال قادری



کائنات عشق کی راجدھانی

انسانیت جاں بلب تھی اور اس کا پیرہن خون اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کائنات پر تاریکیاں مسلط تھیں۔ اور وحشت و بربریت کے خونی بگولوں نے اسے ہر طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گیتی کا فرش تیرہ و تار ظلمت کدوں میں بدل کر رہ گیا تھا اور مجروح انسانیت زخموں سے چور تھی، تاریک رات کے مسافر کسی روشنی کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کائنات بھر کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو کسی راہنما کی تلاش تھی۔ شام میں یہودی و عیسائی پیشوایانِ مذاہب کی نگاہیں اپنے گردو پیش سے مایوس ہو کر فلسطین کی وادیوں میں اس نجات دہندہ کی تلاش میں تھیں جس کی آمد کی بشارت ان کے آسمانی صحیفوں میں دی جا چکی تھی، ظلم و ستم، جبر و استبداد کی چکی میں پسنے والی مظلوم سسکتی کراہتی انسانیت عدل و انصاف رحم و کرم کے لیے مضطرب تھی۔ درد کی ماری دکھیاری عرب کے باہر کی آبادی کے بہت سے لوگ رحمتِ ایزدی سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے۔ امن و آشتی صلح و محبت کے جویاؤں کی پتھرائی ہوئی نگاہیں کسی صبح سعادت کے انتظار میں تھیں۔ مگر جاہل، ضدی، مغرور، خونخوار، جفا پیشہ عرب

کا ضمیر ہر طرح کی روشنی سے محروم تھا، اپنے مقدر کے ظلمتوں کے لیے کسی روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کر رہے تھے وہ اپنے بدترین ماضی پر مفتخر اور حال کی پستیوں پر مغرور و مگن تھے۔ ہر وہ شاہراہ جس پر اسلاف کے نقش قدم نہ تھے ہرگز قابل قبول نہیں تھے وراثت میں پائی جانے والی ہر برائیوں کے امین اور اس کے محافظ تھے ان کا وجود زندگی کی ہر سعادت کی نفی کرتا تھا۔ وہ اپنے ظلمتکدے کو ہر طرح کی روشنی سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے مگر یہی وہ ظلمتکدہ تھا جو امن و شانتی اور روشنی کے متلاشیوں کا مرکز بننے والا تھا، یہی وہ بنجر اور سنگلاخ زمین تھی جسے قدرت نے اپنے احسانات و انعامات کی موسلادھار برسات کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ یثرب جو جہالت و بربریت، نفرت و حقارت، وحشت و انتقام نسلی قبائلی اور خاندانی عصبیتوں کی آماجگاہ تھا۔ معمولی باتوں پر خون کا دھارا بہا دینے والی زمین جہاں وحشت و بربریت کے عفریت انسانی خون سے اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے، امن و سلامتی، رحم و کرم، صلح و آشتی، محبت و اخوت کا سب سے بڑا گہوارہ بنے گی۔ نسل در نسل انتقام کے شراروں کی جگہ محبت و اخوت کے چشمے اُبلیں گے۔ فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والے آفتاب رسالت کی ضیا پاشیوں کے سب سے زیادہ مستحق اسی کے در و دیوار ہونگے، ارض و سما کی ساری نعمتیں برکتیں اور سعادتیں اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سرزمین روئے زمین کے بے بسوں بیکسوں، مجبوروں، فلاکت زدوں کی امید بن جائے گی۔ اس زمین کے فرش پر بیٹھنے والے مرمریں ایوانوں میں رہنے والے کجکلاہوں کے قسمتوں کا فیصلہ کریں گے۔ جہاں کے مکین شکوہ قیصر اور سطوت کسریٰ کو اپنے قدموں سے روندڈالیں

گے جہاں کے فرش نشین اللہ کی عظمت وجلال اور اس کی کبریائی وجبروت کا پرچم چہار دانگ عالم میں لہرا دیں گے۔ وہی یثرب جس کا غلغلہ شرق سے غرب، جنوب سے شمال اور فرش سے عرش تک مچا ہوا ہے۔ دنیا کے نقشے تو درکنار خود عرب میں بھی اسے لائق اعتنا نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ جب کفر و شرک، جہالت و بربریت کی دبیز تاریکیوں کو چیرتے ہوئے رسالت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور وادی بطحا نبوت کی ضیا پاشیوں سے تابناک ہوئی۔ اہل مکہ پر مظلوم سسکتی انسانیت کے نجات دہندہ نبی رحمت (صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت پیش کی تو غریبوں، مسکینوں، مظلوموں، غلاموں، کنیزوں اور چند قابل ذکر نفوس کی ایک قلیل تعداد کے علاوہ اہل مکہ کی اکثریت نے نبئ رحمت علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ نہ صرف مسترد بلکہ پیغمبر امن و امان صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کے ایسے درپئے آزار ہوئی کہ ان پر ان کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا مسلسل تیرہ برس تک دن رات کی جدوجہد اور جانکاہ مشقت کے باوجود اہل مکہ کا کفر و طغیان، عداوت و دشمنی، تمرد و سرکشی، خباثت و کجروی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو شکستہ خاطر کر دیا جس پر انسانیت کے محسن اعظم نے اپنے رب کے حکم سے یثرب کو تبلیغ کے لیئے مستقل ایک نیا میدان منتخب کیا۔ اپنے رفیقوں اور جاں نثاروں کو پہلے ہی سے اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ چھوڑ دیں اپنے آبائی وطن کو بے سروسامانی کے عالم میں ہمیشہ کے لیئے چھوڑتے وقت ان جاں نثاروں کو جن صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا۔ اسکی تفصیل

بہت دردناک ہے۔

یثرب جو ابھی تک عرب کے نقشے پر کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کرسکا تھا۔ مشیتِ ایزدی اس کی ارجمندی کا فیصلہ کرچکی تھی، خاکِ یثرب کو ثریا کا اوج، کہکشاں کا جمال، چاند کی چاندنی، ستاروں کی تابانی پھولوں کی مہک، غنچوں کا تبسم، کلیوں کا نکھار اور آبشاروں کا ترنم، ملنے والا تھا، صبح قیامت تک چہار دانگِ عالم میں اس کی شوکت و عظمت کا غلغلہ بلند ہونے والا تھا۔ ابھی یثرب کی مٹی کو خاکِ طیبہ کا خطاب نہیں ملا تھا۔ ابھی اس نے بڑھ کر قدم ناز کا بوسہ نہیں لیا تھا۔ مگر گھر گھر۔ گلی گلی، فرد فرد کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ جلد ہی خدا کا آخری اور مقدس رسول بیدار بختیوں کی ایک نئی دنیا لئے ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے رونق افروز ہونے والا ہے ہر شخص دیدہ و دل فراش راہ بنا ہوا ہے۔ ساری آبادی سراپا انتظار ہے۔ خوش بختیوں کی معراج ہونے والی ہے۔ ہر شخص چشمِ تمنا لیے ہوئے آرزوؤں کی بارات سجائے تمناؤں کے ناپیدا کنار وسعتوں میں غوطہ زن ہے۔

خوشا نصیب ایک دن ساری آبادی چونک پڑتی ہے۔ دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ مسرتوں کا ایک ہیجان انگیز تلاطم ہے۔ آرزوئے شوق کی گھما گھمی ہے۔ ایک شادی کی سی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کسی نے ان کے سوکھے کانوں میں یہ ملکوتی نغمہ گھول دیا ہے۔

"انسانیت کا نجات دہندہ" ابوبکر کی رفاقت میں مکہ چھوڑ چکا ہے خفیہ طور پر چلتے چلاتے چھپتے چھپاتے راستہ بدلتے کسی بھی وقت وہ یثرب میں نزولِ اجلال فرما سکتا ہے"

بس ابھی سے دلوں کا عالم زیر و زبر ہونے لگا۔ افراد اشتیاق اور جذبۂ شوق کی گھما گھمی میں آبادی کو چھوڑ چھوڑ کر باہر آجاتی کہ کب وہ رحمت و نور، الطاف و کرم اور جمال و جلال کا پیکر مجسم دلنواز تبسم کے ساتھ ہمارے دلوں کے فرش کو عزت بخشے۔ جب سے ان جنم جنم کے پیاسوں نے سُنا کہ عزتوں، حرمتوں، عظمتوں، بخششوں، رحمتوں اور ہدایتوں کا چشمۂ سیّال راستے کے ہر تشنہ لب کو سیراب کرتے منزل بہ منزل نہایت تیزی کے ساتھ ہم کو اپنے آغوش رحمت میں لینے کے لیے ہماری ہی طرف بڑھا چڑھا آرہا ہے ان کی تشنگی دوچند ہو گئی۔

بالآخر ایک دن رحمتوں کا سویرا ہوا گلِ قدس کی خوشبو اڑی، روح کی بہاروں کا رُت بدلی۔ خوش بختیوں کا اجالا ہوا۔ اہلِ یثرب چیخ اٹھے لو! انسانیت کا نجات دہندہ، اللہ کا آخری برگزیدہ اور مقدس رسول، بیدار بختیوں اور اقبال مندیوں کا امین بن کر ہم میں جلوہ افروز ہو گیا۔ اب کیا تھا ہر طرف خوشیوں کا چشمۂ سیّال اُبلنے لگا۔ بہجت و مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ چھوٹے بڑے۔ بچے بوڑھے، مرد عورت، آج کسی کی خوشیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اچھلنے کودنے لگیں اور معصومانہ لے میں اپنی اپنی دفوں پر خوشیوں کا ساز چھیڑ دیا ؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ

ہم پر چودھویں کا چاند ثنیات الوداع (لوگوں کے رخصت کرنے کی جگہ) سے طلوع ہوا

وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعِ

ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک دُعا مانگنے والے دُعا مانگتے ہیں۔

اَیُّھَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاع

اے وہ ذاتِ گرامی جو ہم میں بھیجی گئی آپ ایسے دین کو لائے جو لائق اطاعت ہے۔

اَنْتَ شَرَّفْتَ الْمَدِیْنَہ مَرْحَبًا یَاخَیْرَ دَاع

آپ نے مدینے کو شرف و بزرگی بخش دی اے بہترین دعوت دینے والے تو آپ کے لیے خوش آمدید ہے مرحبا ہے۔

فَلَبِسْنَا ثَوْبَ یَمَنٍ بَعْدَ تَلْفِیْقِ الرِّقَاع

پس ہم نے یمنی کپڑے پہنے جبکہ اس سے پہلے پیوند لگے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

فَعَلَیْکَ اللّٰہُ صَلّٰی مَا سَعٰی لِلّٰہِ سَاع

پس آپ پر اللہ عزوجل اس وقت تک رحمتیں نازل فرماتا رہے جب تک کوشش کرنے والے کوشش کرتے رہیں۔

اور پھر اس محسن انسانیت، معلم کائنات آقائے دوجہاں صلی اللہ تعالے علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم نے خاک یثرب کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرماتے ہوئے اب تک کے یثرب کو ہمیشہ کے لیے مَدِیْنَۃُ النَّبِی صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے بدل دیا اور ارشاد فرمایا اب آج سے کوئی اسے یثرب نہ کہے۔

بلکہ یہ **مدینہ** ہے

اور جب یثرب مدینہ سے بدل گیا تو اس کے لیے عشاقان بارگاہ رسالت نے کیسی کیسی آرزؤں کی بارات سجائی ہے۔ بھیگی ہوئی پلکوں کی چلمن سے ذرا ان آرزوئے شوق کا تماشہ تو دیکھیں ؎

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکو وہ نکوئی کی بھی ہے آبرو
مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

آرزوئے جنت الماوٰے بروں کردن ز دل
جنتم ایں بس کہ بر خاکِ درت ماوٰی کنم

(مولانا جامی)

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ دروئے دلبر است

(ڈاکٹر اقبال)

اُن کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

(اعلیحضرت)

طیبہ میں مر کے سیدھے چلے جاؤ آنکھیں بند
سیدھی سڑک یہ شہرِ شفاعت نگر کی ہے
عاصی بھی ہیں چہیتے یہ طیبہ ہے زاہدو
مکہ نہیں کہ جانچ جہاں خیر و شر کی ہے
پھول تو پھول میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

(اعلیحضرت)

مر کے جیتے ہیں جو تیرے در پہ جاتے ہیں حسن
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر
کون کہتا ہے کہ زینت خلد کی اچھی نہیں
لیکن اے دل فرقتِ کوئے نبی اچھی نہیں

(علامہ حسن)

مدینہ کی زمیں بھی کیا زمیں معلوم ہوتی ہے
لئے آغوش میں عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
تعالی اللہ اے ارضِ مدینہ تیرا کیا کہنا
بلندی عرش کی زیرِ زمیں معلوم ہوتی ہے

(محدث اعظم سید محمد کچھوچھوی)

طیبہ نہ سہی افضل مکّہ ہی بڑا زاہد ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے

(اعلیحضرت) ————

حسرت میں خاک بوسیٔ طیبہ کی اے رضا ٹپکا جو چشم مہر سے وہ خون ناب ہوں

(اعلیحضرت) ————

اس در کی حضوری ہی عصیاں کی دوا ٹھہری ہے زہر معاصی کا طیبہ ہی شفا خانہ

(مفتیٔ اعظم ہند) ————

کسی نے لی رہِ کعبہ کوئی گیا سوئے دیر
پڑے رہے ترے بندے مگر ترے در پر
اخیر وقت ہے آسی چلو مدینہ کو
نثار ہو کے مرو تربت پیمبر پر

(مولانا آسی)

حریم کعبہ میں بھی یاد آئی طیبہ کی
کہ یادگارِ حرم میں ہے کوبہ کو تیری
دشتِ طیبہ ہے یہاں چل سر کے بل اے اعظمی
مصطفےٰ کا جنتی دربار تھوڑی دور ہے

(اعظم الطاف اعظمی)

یہ کعبہ ہے یہاں دیوانگی بھی حسن ایماں ہے
اگر طیبہ میں دامن ہاتھ سے چھوٹا تو سب چھوٹا

(بیکل)

تلاش نقش کف پائے مصطفےٰ کی قسم
چنے ہیں آنکھوں سے ذرات خاک کوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(بیدم وارثی)

نام مدینہ لے لیا چلنے لگی نسیم خلد
سوزش غم کو ہم نے بھی ایسی ہوا چلائی کیوں

(اعلیحضرت بریلوی)

او پائے نظر ہوش میں آ کوئے نبی ہے
آنکھوں سے یہاں چلنا بھی بے ادبی ہے

مدینہ جاؤں پھر آؤں اور پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

مسلمان تو مسلمان ہندو شعراء بھی مدینۃ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں عرض کناں ہیں۔ فکر کی طہارت جذبات کی صداقت اور والہانہ عقیدت ملاحظہ ہو ـــ

یہ ارضِ مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنت بھی یہیں مالکِ جنت بھی یہیں ہے
(چندر پرکاش)

اے خاک مدینہ ترے اعزاز کے صدقے
جو عرش نشیں ہے وہ یہاں فرش نشیں ہے
(جوہر بجنوری)

دل محو ہے ہمارا مدینے کی سیر میں
گھر بیٹھے ہو رہی ہے زیارت رسول کی
(راجیشور ناتھ الٰہ آبادی)

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی
شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ
(مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد حیدرآبادی)

یہ ربطِ نبوت اور وحدت ہر حال میں یکساں ہوتا ہے
جھکتی ہے جبیں کعبہ کی طرف اور دل میں مدینہ ہوتا ہے
(کرشن بہاری نور لکھنوی)

درِ رحمت پہ حاضر ہیں شفاعت چاہنے والے
بڑی حسرت سے امید شفاعت لیکے آئے ہیں
(گنیش بہاری طرز)

جب کبھی جاتے ہیں چل کر سوئے طیبہ خوش نصیب
کارواں کے ساتھ گرد کارواں ہوتا ہوں میں !
(کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)

میں اگر خاک نشینِ درِ احمد ہوں گا
رفعتِ عرش کے ہمسر مری بستی ہوگی
جیتے جی روضۂ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا
رُوح جنّت میں بھی ہُوگی تو ترستی ہوگی

(منشی شنکر لال ساقی)

جی چاہتا ہے کوچۂ انوار میں چلوں
اپنے رسولِ پاک کی سرکار میں چلوں

(پنڈت ہری کشور شرما نظر)

مجمع البحرین

وادیٔ نیل کے کنارے "طحا" نام کی وہ آبادی جہاں مسرتوں کے آبشار سے قہقہوں کے نغمے پھوٹا کرتے تھے۔ عالم سرخوشی میں کیف و مستی کے چشمے اُبلتے تھے۔ نور و نکہت میں ڈوبی فضائیں رنگ و آہنگ کی سرمستیاں، جمال و رعنائی کی تابانیاں ہر طرف سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں، آج بہت سوگوار ہے۔ فضاؤں میں بھی حزن و ملال اور غم کی ایک چادر سی تنی ہے۔ سوگواری کیفیت سے ماحول تک بوجھل ہوگیا ہے۔ ایک طرف کرب آلود سکوت ——— ایک غمناک سناٹا ——— دریائے نیل کی خاموشی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بستی والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

کارگاہِ حیات میں زندگی اور موت تو ایک عام سی بات ہے۔ زندگی کی پہلی آواز ہی اس بات کی دلیل ہے کہ سازِ حیات کے اس تار کو ٹوٹنا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب　　موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

زندگی اور موت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آنکھیں کھولتے، بند کرتے ہیں ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جس پر کسی کو حیرت ہے اور نہ تعجب! کتنے ہی دارا و سکندر آئے اور چلے گئے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

کتنے ہی مہ وشوں، لالہ رخوں، مہ جبینوں، گل بدنوں کا سورج چمکا دلوں کی وادیاں زیر و زبر ہوئیں، خون کی ندیاں بہیں، ہزاروں گردنیں کٹیں، خرام ناز کی حشر آفرینی سے ایک عالم تہ و بالا ہوا۔ مگر شہر خموشاں میں کسی بھی گوشے میں دور دور تک اُن کا نام و نشان نہیں ملتا۔

——— مگر نہیں! انھیں ہزاروں لاکھوں زندگیوں میں کسی کی موت اور زندگی ایک ایسا حادثہ بن جاتی ہے کہ جس کی یادوں کے سائے سے دامن بچانا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا حادثہ "طیا" نام کی اس بستی میں محمد بن سلامہ کی بیوی کو بھی پیش آتا ہے۔

بستی کی بڑی بوڑھیاں اور تجربہ کار دائیاں اپنی کوششیں کر کے تھک ہار گئیں۔ مسلسل گھنٹوں زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی کو شکست نصیب ہوئی ؎

پھر آج کسی سوچ میں ڈوبے ہیں در و بام
کیا جانئے کیا حادثہ بستی میں ہوا ہے

گھر سے باہر تک صف ماتم بچھ گئی۔ محمد بن سلامہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ جس شاخ کے سہارے وہ اپنا نشیمن تعمیر کرنا چاہتا تھا، وہ شاخ ہی ٹوٹ گئی۔ مستقبل کے سارے منصوبے ایک خواب پریشاں ہو کر رہ گئے ؎

غم زندگی سے اجڑ گئیں وہ تصورات کی محفلیں ۔۔۔ کبھی شام غم بھی عزیز تھی مگر اب سحر کی تلاش ہے

ہائے رے بے بسی! زندگی کے ہر موڑ پر ہر دکھ سکھ کی ساتھی "رفیقۂ حیات" زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ پاس رہ کر بھی آخری ملاقات سے محرومی ہے

ہائے رے انسان کی مجبوریاں
پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں

حرماں نصیبی کا یہ عالم کہ ارد گرد اظہار تعزیت اور دم دلاسے کے لئے بھی کوئی موجود نہیں۔ اتنا ہوش بھی کسے ہے، کیونکہ بچہ مرنے والی ماں کے پیٹ کے اندر رہی ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر سوالیہ نشان بنا ہوا ہے "اب کیا ہوگا"، مرنے والے کی کسی عزیزہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا " ہوگا وہی جو ارحم الراحمین کی مرضی ہوگی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک زندگی کا چراغ گل ہو گیا اب دوسری زندگی بچانا ہمارا فرض ہے" ان میں ایک تجربہ کار بڑھیا نے جواب دیا۔ کوشش اپنا کام نتیجہ رب کے دستِ قدرت میں! ان آنسوؤں کو ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ انھیں اپنے رب کے حضور بہاؤ اور زندگی اور موت کے مالک سے اس دوسری زندگی کی بھیک مانگو" دوسری زندگی کون" کیا صدمات نے تمھارے دماغ الٹ دیئے ہیں؟ دیکھ نہیں رہی ہو کہ یہ حرماں نصیب پورے دنوں سے تھی۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں زندہ ہے خدا سے دعا کرو ہمیں وہ دوسری زندگی بچانے میں کامیاب فرمائے بڑی احتیاط کے ساتھ ماں کا پیٹ چاک کیا گیا اور کافی جدوجہد کے بعد ارد گرد کھڑی عورتوں کو بچے نے بڑی نحیف اور کمزور آواز کے

85216

ساتھ اپنی زندگی کا احساس دلایا ۔

اُمید کی مدھم سی اک لَو ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

عالم سرخوشی میں ایک معمّر عورت باہر نکلی

سلامہ کے بیٹے اب ان سب آنسوؤں کو پونچھ ڈالو، تمھاری آرزوؤں کی جنّت، حاصل تمنّا خلد آشیانی شریک حیات نے جاتے جاتے تمھارے چہرے کی شادابی اور غمناک ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔ بڑا خوبصورت اور یادگار تحفہ ایک بیٹے کی شکل میں چھوڑ گئی ہے جو تمھاری شبستان محبّت کا ایک خوبصورت پھول ہے۔

غموں کے ان کربناک لمحوں میں خوشی کی یہ سوغات بہت حد تک تمھارے غموں کا مداوا کر سکتی ہے۔ تمھیں یہ مسعود بیٹا مبارک ہو۔

جنّت مکانی کے اس امانت کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا کر ماں باپ دونوں بن کر تمھیں اس کی پرورش کرنا ہے۔ خدائے ذوالجلال تمھیں صبر جمیل اور تمھارے حوصلوں کو توانا عطا فرمائے۔

بیوی کو سپرد خاک کرنے، اپنی تشنہ کام حسرتوں، تمنّاؤں اور آرزوؤں پر اپنے ہاتھ سے مٹّی ڈال لینے کے بعد جب محمد بن سلامہ نے گھر آکر بیٹے کو گود میں لیا تو اسکی آنکھیں بہنے لگیں! یہ بچّہ اپنی ماں کے گود میں کتنا اچھا لگتا! کاش! اس بدنصیب کو چند ہی لمحوں کا موقع مل جاتا کہ اسے دیکھ کر اپنی پیاسی آنکھیں سیراب اور کلیجے سے لگا کر دل کی دھڑکنوں کو سکون دے لیتی ۔

غنچے چُپ ہیں گل ہے ہوا پر کس سے کہیئے دل کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگا نہ بھی

جب بھی محمد اپنے بیٹے کو اپنی آغوشِ محبت میں لیتا، دل پر ایک چوٹ پڑتی۔ جانے کہاں سے بہت سارے درد جاگ اٹھتے۔ یادوں کے قافلے جوق درجوق ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگتے اور شریکِ حیات کے ساتھ بیتے ہوئے خوشگوار لمحے ایک آزار کی شکل اختیار کر لیتے

اپنی سانسوں میں ہے ہردم تری یادوں کی مہک
پھر بھلا کیسے تجھے دل سے بھلائے رکھیں

بچے کی پرورش، سعیٔ معاش، فکرِ امروز و اندیشہائے فردا سے چین نہیں لینے دیتے۔ انسانی فطرت کے مطابق شفقتِ پدری سے وہ مالا مال تو تھا مگر ماں کا وہ دلِ پُر اضطراب اور بیقراریاں کہاں سے لاتا جو بات بات پر اپنے بچے کے لیے تڑپ اٹھتا ہے ؏

آج احساس ہوا ہے مجھے تنہائی کا

ماں کی شفقتوں کی ٹھنڈی چھاؤں، ممتا کی بے چینیوں کی نرم دھوپ، اور گداز پلکوں کے سائے سے محروم وہ حرماں نصیب پروان چڑھنے لگا۔ محمد بن سلامہ بیٹے کا ہر ناز اٹھاتا رہا۔ یہاں تک کہ مہ و نجوم کی گردش نے بچے کو زندگی کے اس اسٹیج تک پہونچا ہی دیا جہاں سے شعور و آگہی کا قرینہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کا قد تو عام بچوں ہی کی طرح تھا مگر ذہنی نشو و نما کے معاملے میں اپنے عمروں سے بہت آگے تھا۔ یہی وجہ تھی کمسنی ہی میں ابتدائی تعلیم مکمل کر کے مشہور زمانہ شافعی فقیہ حضرت شیخ ابراہیم مزنی کے درس گاہ

کے لائق ہو چکا تھا ؎

بچپنے میں تو قد میوسں ہیں لاکھوں فتنے
رفتہ رفتہ تیری رفتار قیامت ہوگی

تیسری صدی کے نصف آخر میں حضرت ابوجعفر احمد بن ابی عمران موسیٰ کی علمی جلالت کا شہرہ دور دور تک پہونچ چکا تھا۔ ان کے علم کی خوشبو سے ایک عالم مشکبو ہو رہا تھا۔ بھینی بھینی، پیاری پیاری خوشبو سے سعید روحیں کیف بار ہو رہی تھیں۔ تشنگانِ علوم کے لیے اُن کی درسگاہ ایک چشمۂ سیّال کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے علمی فیض کا سیل رواں اس راہ کے ہر تشنہ لب کو سیراب کر رہا ہے۔ ان کی علمی عظمتوں فکری رفعتوں اور بیکراں ذہنی بلندیوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ کی نسبت تلمذ امام الائمہ، سراج الامۃ، فخر عجم، رشکِ عرب حضرت ابوحنیفۃ النعمان سے متصل ہے۔ آپ شاگرد ہیں حضرت محمّد بن سماعہ کے وہ تلمیذ رشید ہیں قاضی القضاۃ حضرت امام ابویوسف کے اور حضرت امام ابویوسف امام اعظم ابوحنیفہ کی جلالتِ علمی، اصابتِ فکر کے مظہر اتم اور آپ کی فقہی عبقریت کے شاہکار اعظم ہیں۔ اس نسبتِ کرامت نے آپ کے علمی شکوہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے تشنگانِ علوم کا جمگھٹا آپ کی درسگاہ میں رہنے لگا۔ دور دراز مقام سے طالبانِ شوق کا قافلہ جوق در جوق آتا رہتا۔

روایت دیرینہ کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اپنے اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق ہر شخص علم کے اس بیکراں بحر سے اپنا حصہ لینے میں مصروف ہے علوم و معارف کے وہ خزانے جو اپنے اساتذہ

سے ملے تھے۔ بڑی فیاضی کے ساتھ مستحق باحوصلہ اور اہل تلامذہ کو تقسیم فرمارہے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، ادب، معانی، بلاغت کا آبشار ہر تشنہ کام کو شاد کام کر رہا ہے۔ کہ اسی اثناء میں ایک اجنبی نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر بڑے ادب اور قرینے کیساتھ ایک نوخیز لڑکے نے درسگاہ میں قدم رکھا۔ آثارِ مسافرت کے باوجود چہرے پر بڑی دلآویزی تھی، تیکھے نقوش، بھیگی ہوئی مسیں، آنکھوں میں ذہانت کی مخصوص چمک بلند اور کشادہ پیشانی سے اقبال مندی کے ہویدا آفتاب ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

کا مکمل مصداق تھا۔ چند ساعتوں کے لیے شیخ و تلامذہ کے نگاہوں کا مرکزِ توجہ بنا رہا۔ سلام و دعا کے بعد حضرت شیخ ابوجعفر نے پوچھا۔

"صاحبزادے کہاں سے آرہے ہو؟"

"شیخ مزنی کی بارگاہ سے!! آنے والے نے بڑی متانت اور شائستگی سے جواب دیا ۔

"کون! ابراہیم مزنی؟

جی ہاں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہو؟

"بہت اچھی طرح سے وہ شافعی مسلک کے زبردست عالم اور صاحبِ نسبت بزرگ ہیں ان کے مزاج تو بخیر ہیں"

"الحمدللہ: وہ ہر طرح سے بخیر و عافیت ہیں۔ البتہ اُن کی نظر میں میری ہی خیریت خطرے کی زد پر ہے !!

"صاحبزادے بات کیا ہے؟ کچھ اکھڑے سے نظر آتے ہو!"

"سرکار عالی! بات ہی ایسی ہے۔ آج سے پہلے میں شافعی مسلک پر تھا!"

"کیا مطلب؟ کیا اب تم شافعی مسلک پر نہیں ہو؟"

وہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں "شافعیت" کو ماموں جان کی درسگاہ میں چھوڑ آیا ہوں"

"کون ماموجان؟ کیا تم ابو ابراہیم مزنی کے بھانجے ہو؟"

"جی ہاں! اس گنہ گار کو ان کا بھانجہ ہونے کا شرف حاصل ہے"

"سبحان اللہ! بڑی خوشی ہوئی کہ علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہو۔ اچھا درس ختم ہونے کے بعد تم مجھ سے تفصیلی ملاقات کرنا اور پھر قال اللہ و قال الرسول کی صدائے زمزمہ نواز بلند ہونے لگی۔

درس ختم ہونے کے بعد شیخ ابو جعفر نے کوچۂ طلب کے اس نو وارد کو طلب فرمایا۔ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے فرمایا "بیٹا تمھارا نام کیا ہے؟"

"احمد"

"بہت خوب! میرے ہی ہمنام ہو! مجھ سے پڑھنا کیا چاہتے ہو؟"

"فقہ حنفی"

"فقہ شافعی کی تکمیل ہو گئی؟"

"نہیں! ماموں جان کی درسگاہ میں فقہ شافعی ہی کی تکمیل کا ارادہ تھا مگر اب میں فقہ حنفی کا عالم بننا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں اسمیں کمال حاصل کروں۔ حالانکہ ماموں جان یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ بخدا تو زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا"

"بیٹے! اب میں تمھارے تبدیلئ مسلک کی تفصیل جاننا چاہوں گا اگر

تم مجھے مطمئن کر سکے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اپنی درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دوں گا۔"

"میں اصل واقعہ کی تفصیل گوش گزار کرنے کے لیئے خود ہی بے چین ہوں۔ ہوا یوں کہ حسب معمول ماموں جان کا درس جاری تھا کہ اثنائے درس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر کوئی حاملہ عورت وضع ولادت سے قبل ہی مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آیا زچہ کے ساتھ بچہ بھی دفن کیا جائے گا یا ماں کا شکم چاک کر کے بچہ کو بچایا جائے گا؟۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کا یہ مسلک ہے کہ بچہ کو بچانے کے لیے ماں کا شکم چاک نہ کیا جائے بلکہ ماں کے ساتھ بچہ بھی دفن کر دیا جائے" جبکہ امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ "نہیں! اگر واقعی بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہو تو اس کو بچانے کے لیے ماں کا شکم چاک کیا جائے گا۔ اس کو ماں کے ساتھ قبر میں دفن نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت امام شافعی کے اس مسلک کا حال معلوم کر کے مجھے بڑی وحشت اور سخت صدمہ ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر مسلسل اعتراضات اور شدید اختلاف کیا کہ کیا ایک ایسی جان جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے وجود بخش کر اسے تکمیل فرمایا ہو۔ یہ اس پر ظلم نہیں؟ اور کیا یہ اس کا قتل عمد نہیں؟ عالم غضب میں میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایسے شخص کے مسلک ہی سے راضی نہیں جو میری ہلاکت پر راضی ہو۔ میری ولادت سے قبل میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت امام اعظم کے بے غبار مسلک پر میری والدہ مرحومہ کا شکم چاک کر کے مجھے حیات نو عطا کی گئی۔ جبکہ شافعی مسلک

میری جنت مکانی والدہ ماجدہ کے ساتھ میرا بھی فاتحہ پڑھ چکا تھا ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ماموں جان فطرتِ انسانی کے اس جائز مطالبے کو تسلیم کر کے مجھے تسکین مرحمت فرمانے کے بجائے بھڑک اٹھے الٹا مجھ کو موردِ الزام قرار دینے لگے اور قہر و غضب میں ڈانٹتے ہوئے فرمانے لگے" ارے گستاخ و بے ادب تیری یہ جرأت کہ اتنے عظیم امام اور صاحبِ فضل و کمال پر تو یہ اعتراض کرتا ہے جس کی ذہانت، فقاہت اور علمی جاہ و جلال کا شہرہ اکنافِ عالم میں پھیلا ہوا ہے چھوٹا منہ بڑی بات! توبہ کر اور حضرت امام کی روح سے معافی مانگ"۔

" اس میں توبہ اور معافی کی بات کہاں سے آگئی؟ حضرت امام اور ان کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، عبقریت، اصابتِ فکر، ذہانت فطانت، دانش و بینش الغرض تمام تر فضل و کمال کے باوجود وہ ایک فقیہ اور مجتہد ہیں۔ خطائے اجتہادی کا امکان بہرحال ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا ہر اجتہاد درست، صائب اور قابلِ قبول ہی ہو جیسے اسی مسئلے کو لے لیں جو انسانی فطرت سے قطعی میل نہیں رکھتا۔ ویسے اُن کی حسنِ نیت اور اجتہادی کوششوں میں اگرچہ خطائے اجتہادی ہی کیوں نہ ہو اُس کا اجرِ عظیم اُن کے رب کے یہاں تو محفوظ ہی ہے"۔

" ارے نالائق اگر تیری یہی کٹ حجتی رہ گئی تو تو پڑھ چکا اور بن چکا فقیہ۔ اپنے ذہن و فکر کی اصلاح کر نہیں تو بخدا تو زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا"۔

" فقہ شافعی سے مجھے کوئی کد نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی کی یکراں شخصیت کے احترام سے آج بھی خانۂ دل معمور ہے امتِ مسلمہ پر اُن کے

بے پایاں احسانات ہیں۔ ارباب علم وفن کی فہرست میں اُن کی عظیم شخصیت اپنے پورے وقار کے ساتھ موجود ہے۔

مگر اس مسئلے میں مجھے دُنیا کی کوئی طاقت، کوئی دلیل، کوئی بُرہان، مطمئن نہیں کر سکتی۔ میں اس نازک ترین مسئلے میں بے حد جذباتی ہو گیا ہوں جواباً عرض کر دیا کہ مجھے ایسی فقاہت اور ایسا مسلک نہیں چاہیے جس میں ہم جیسے سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں آج ہی سے شافعی مسلک سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے سلام عرض کیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُن کی درسگاہ سے نکل آیا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ھیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بڑی شہرت سن کر حضور والا کی بارگاہِ کرم میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہو گیا ہوں مجھے اپنے قدموں میں جگہ عطا فرما کر میرے خالی دامن کو علوم و آگہی بالخصوص فقہ حنفی کے خزانے سے بھر دیں۔"

اس لڑکے کی سرگذشت سے شیخ جعفر کافی متاثر ہوئے۔ پر شفقت لہجے میں فرمایا "بیٹے میرے پاس علم کا جو بھی تھوڑا بہت سرمایہ ہے اسے سپرد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہ تو تمھاری اپنی صلاحیتوں، مقصد سے وَالہانہ لگاؤ اور سچی تڑپ پر منحصر ہے کہ تم مجھ سے کتنا کچھ حاصل کر سکتے ہو۔ ویسے مجھے کچھ اندازہ ہو چکا ہے کہ میں تمھاری منزل کی ابتدا تو ہوں مگر انتہا نہیں۔ جاؤ تم خوب محنت کرو۔ مولٰے عزوجل تمھیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب و بامراد فرمائے" گردشِ لیل و نہار اور زمانے کے اُلٹ پھیر

میں اس لڑکے کا علمی سفر جاری رہا۔ بتدریج ذہنی ارتقاء کی اُن بلندیوں تک پہونچ گیا جن تک اُس کے ہمعصر صرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے اور بس! فطری ذہانت، وہبی فیضان اور شیخ جعفر کی خصوصی توجہ کی بدولت وہ آپ کی درسگاہ کا ایسا ہیرا ثابت ہوا جسکی شعاؤں سے مصر کے در و بام جگمگانے لگے۔

"تفقہ فی الدین" میں کمالات کی منزل جوں جوں قریب آنے لگی اس کی تشنگی بڑھتی گئی اس کے دل و دماغ میں علم و یقین کا اجالا جیسے جیسے پھیلتا گیا ھل من مزید کی تڑپ بڑھتی گئی ؎

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

بالآخر وارفتگیٔ شوق نے اتنا مجبور کیا کہ ایک دن انتہائی شفیق و مہربان استاد کی اجازت سے مصر چھوڑ دیا ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھکو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

صحرا کی وحشتوں، راستے کی جان لیوا کلفتوں، اور سفر کی صعوبتوں کو روندتے ہوئے ایک صبح اس نے "شام" کی سرزمین پر قدم رکھا۔ مصر ہی میں اُس نے وقت کے بے مثل فقیہ اور ملکِ شام کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) حضرت ابو حازم کی اعلیٰ درجہ فقاہت کا چرچہ سن رکھا تھا۔ آرزوئے شوق نے کشاں کشاں اُن کی چوکھٹ تک پہونچا دیا۔ قاضی القضاۃ سے تفصیلی ملاقات کے بعد اسے یقین ہو چلا کہ اب تفقہ فی الدین کے سلسلے میں یہی میری آخری منزل ہو گی چنانچہ یہی ہوا۔ اس کی

ذہانت، ذکاوت، فقہ حنفی سے وَالہانہ لگاؤ اور بے پناہ وابستگی دیکھ کر شیخ ابو حازم کو اس پر پیار آگیا۔ اور ایسی خصوصی توجہ فرمائی کہ وہ اپنے وقت کے فقیہوں کا سرتاج بن گیا۔

میدانِ فقہ میں اپنی انفرادیت کا سکّہ بٹھا دینے کے بعد فقہ ہی کی طرح حدیث کو بھی اپنا خصوصی میدان منتخب کیا۔ اور اس نازک اور دشوار ترین سفر میں جتنے بھی ائمہ فن، مشائخ وقت اور محدثینِ زمانہ ملے ان سب سے استفادہ اور اکتسابِ فیض کیا جن کی طویل صحبتوں کے فیضان نے اسے فقیہ و مجتہد کے ساتھ ہی ساتھ نہ صرف ایک عظیم محدّث بلکہ حافظُ الحدیث بنا دیا۔

حضرت سلیمان بن شعب کیسانی، ابو موسیٰ صایقی، ہارون بن سعد، یونس بن عبد اعلیٰ، ہارون بن سعید ایلی، ابراہیم بن ابو داؤد، بکار بن قتیبہ، عبد الغنی بن رفاعہ، محمد بن سعید ایلی وغیرہم جیسے ائمہ فن اور محدثین زمانہ کا شمار اس کے اساتذہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔

اب محمد بن سلامہ کے بیٹے احمد کی شہرت اور اس کے علمی فضل وکمال کا آوازہ دُور دُور تک پہونچ چکا ہے۔ عالمِ اسلام میں اس کی علمی جلالت و مرتبت کا شہرہ تیزی کے ساتھ پھیلا جا رہا ہے۔ ہر طرف سے طالبانِ شوق کا قافلہ چلا آ رہا ہے۔ اس کی مسندِ علم و فضل طالبانِ علوم دینیہ کے لیے مرکزِ ہجومِ آرزو بن چکی ہے بتدریج وہ عالمِ اسلام کا مرکزِ عقیدت بنتا گیا۔ بڑے بڑے کجکلاہوں کی گردنیں اس کے علمی وقار و دبدبے کے آگے جھک گئیں۔ آج فقہاء و محدثین کی طویل فہرست میں اس کے تلامذہ کے نام جنت نگاہ بنے ہوئے ہیں۔

عالمِ اسلام نے بڑے احترام اور عقیدت و محبت کے ساتھ محمد بن سلامہ کے بیٹے احمد کو حضرت امام طحاوی کے لقب سے یاد کیا۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ تیسری صدی ہجری کے ایک عظیم محدث اور بے مثل فقیہ تھے۔ فقہا، و محدثین کے طبقات میں اُن کا شمار یکساں ہوتا ہے۔ سلفِ صالحین اور علماءِ متقدمین میں ایسی شخصیتیں نایاب کی حد تک کمیاب ہیں کہ جن کا شمار فقہاء و محدثین میں یکساں ہوتا ہو۔ گویا آپ کی وہ پیکرِ شخصیت اساتینِ امت میں **مجمعُ البحرَین** کی حیثیت رکھتی ہے ؎

کیا حُسن ہے، جمال ہے، کیا رنگ و روپ ہے
وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

محدثین آپ کو حافظ اور امام کہتے ہیں (یاد رہے کہ محدثین کی اصطلاح میں **حافظ** اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کو ایک لاکھ حدیثیں متناً و سنداً اور اس کے راویوں کے احوال جرحاً و تعدیلاً یاد ہوں) اور فقہائے عظام نے آپ کو مذہبِ حنفی کا ایک عظیم مجتہد مانا ہے۔

علم و فضل ہی کی طرح آپ صاحبِ زہد و تقویٰ بھی تھے۔ عوام سے لے کر خواص تک احترام و عقیدت سے آپ کے حضور خمیدہ سر تھے آپ بڑے بیباک نڈر اور حق گو تھے۔ نتائج کی پروا کیے بغیر کلمۂ حق کا اظہار برملا فرماتے اور بڑی سختی کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت امام ابوجعفر طحاوی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ہر دور میں مورخین اور سیرت نگاروں نے آپ کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، کلام، تاریخ رجال وغیرہ پر آپ نے کثیر اور معرکۃ الآرا تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یوں تو آپ کی تمام کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں مگر ان تمام عظیم الشان علمی شاہکاروں میں، "شرح معانی الآثار" کو بڑی اہمیت حاصل ہے مسلک حنفی تو الگ رہا کسی بھی مسلک میں اس کتاب کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی ہے جس حسن وخوبی اور ذہانت کے ساتھ حدیث، فقہ رجال کے متعدد علوم کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ وہ صرف "امام ابوجعفر طحاوی" ہی کا حصہ ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

امام طحاوی کو اس کتاب لکھنے کا مقصد صرف احادیث جمع کرنا نہیں بلکہ اُن کو یہ ثابت کرنا تھا کہ مسائل شرعیہ میں رشک عرب، فخر عجم، امام الائمہ، سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عظیم موقف احادیث کے خلاف نہیں (جیسا کہ تنگ دل حاسدین بے ضمیر منکرین خصوصًا ماضی وحال کے وہابیہ غیر مقلدین کا پروپیگنڈہ ہے) اور اگر بظاہر کوئی حدیث امام اعظم کے مسلک کے خلاف نظر آتی ہے۔ تو وہ مؤول ہے یا منسوخ (جس سے قطعًا بے خبر ہیں حدیث دانی کے یہ دعویدار بالشتے بیوقوف)

اس عظیم کتاب میں حضرت امام طحاوی کا علمی شکوہ پورے جاہ وجلال

کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کہیں احادیث پر فنی گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو کہیں مخالفین کے پیش کردہ روایات پر جرح کرتے ہوئے اسماء الرّجال کا دفترِ گراں بار لئے دکھائی دے رہے ہیں اور کہیں کہیں پر تو ان کے موقف کا عقلی طور پر پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے دلائل و براہین سے ان کے موقف کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب روایت و درایت کا شاہکارِ اعظم ہے۔

حضرت حافظ امام ابو جعفر طحاوی ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے اور بیاسی سال کی قابلِ رشک زندگی گذار کر ۳۲۱ھ میں واصل بحق ہوئے

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اندازِ مسیحائی

زلفِ بنگال، چشمِ بنگال، سحرِ بنگال کے تمام تر حشر آفرینیوں کے باوجود سلطان غیاث الدین بلبن کا فیاض بہادر، اولوالعزم بیٹا بغراخاں اپنی زندگی کی مشکل ترین مہم سے سرخرو ہو کر جشنِ فتح بنگال منا رہا تھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرحبا، مبارک و سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ درباری شعرا اس عظیم الشان فتح پر ایک سے بڑھ کر ایک فتحنامے اور قصیدے پیش کر رہے تھے۔ فراخ دل، عالی حوصلہ اور فیاض شاہزادہ بھی فیضِ عطا کا پیکرِ مجسم بنا ہوا تھا۔ اور جب طوطیٔ ہند، خاقانیٔ زماں، بلبلِ خوشنوا خسرو نے منفرد لب و لہجہ میں اپنا قصیدہ پیش کیا تو رنگ و آہنگ کا موسم بدل گیا اور پڑھنے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا قصیدہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا کہ ؎

پھر اس کے بعد چراغوں کی روشنی نہ رہی

تو پھر شہزادے نے بھی جود و سخا کی تاریخ میں ایک جلی عنوان کا اضافہ کرتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو پانچ لاکھ تنکے عطا کئے۔

امیر خسرو اس گرانقدر انعام کو خچروں پہ بار کرا کے شاہی لشکر کے ہمراہ دلی واپس ہوئے۔

شاہی لشکر دلی کی طرف رواں دواں تھا۔ منزلِ مقصود کا فاصلہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے والدین، بیوی بچوں سے جلد تر ملاقات کے شوق میں فوج زمین کی طنابیں سمیٹ رہی تھی۔

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کائنات کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے دوسرے پہر میں داخل ہونے والی تھی کہ اچانک ایک سرائے سے گزرتے ہوئے امیر خسرو نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ آپ کے رکتے ہی پیچھے رواں دواں لشکر رک گیا۔ منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے کارواں کے اچانک رک جانے سے فوج میں فطری اضطراب ہوا۔ آپ کے پیچھے چلنے والے ایک فوجی نے ادب کے ساتھ دریافت کیا "حضور! آپ نے سواری کو کیوں روک لیا؟"

"آہ! تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں"

"بوئے شیخ می آید" (پیر کی خوشبو آرہی ہے)

"بوئے شیخ؟"

"ہاں ہاں بوئے شیخ، مرشد کامل کی خوشبو!"

"حضور والا دلی تو ابھی بہت دور ہے جانے کتنی میل دور! اتنی دور سے بوئے شیخ کا کیا مطلب ہے؟"

"ارے بھائی بوئے شیخ کا مطلب بوئے شیخ ہی ہوتا ہے" یہ کہہ کر اضطرابی کیفیت میں گھوڑے سے اتر پڑے۔ وارفتگی شوق میں سرائے کی طرف لپکے جہاں سے بوئے شیخ آرہی تھی۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر مطمئن کرنا چاہا۔

"حضور والا! اس سرائے سے بوئے شیخ کا کیا واسطہ؟"

آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"تجھے کیا معلوم بوئے شیخ کیا ہوتی ہے" ؎

تونے تو کر دیا طبیب آتش سینہ کا علاج
آج کی دردِ آہ میں بُوئے کباب آئی کیوں

میرے بھائی اگر بوئے شیخ اس طرف سے نہیں آئی تو خسرو کی مشامِ جاں معطر و بے خود کیوں ہوئی۔ ہو نہ ہو اس سرائے میں کوئی خاص بات ضرور ہے جسنے ارد گرد کے ماحول کو عطر بیز کر رکھا ہے" ؎

کوچے کوچے میں مہکتی ہے یہاں بُوئے قمیص
یوسفستاں ہے ہر گوشۂ کنعانِ عرب

رات بھیگ چکی تھی۔ سیاہ شب کی زلفیں بکھر چکی تھیں۔ مسافر نیند کی میٹھی آغوش میں پہونچ چکے تھے البتہ سرائے کا مالک جاگ رہا تھا۔ نوجیوں کی مسلسل دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ جوں ہی نظر پڑی حواس باختہ ہوگیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کپکپاتی آواز میں گویا ہوا "سرکار ہم سے کوئی غلطی ہوئی؟ کوئی جرم سرزد ہوا، جانے انجانے میں کوئی بھول ہوئی؟"

ارے نہیں بھائی! تم سے کوئی جُرم سرزد نہیں ہوا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم چند مسافروں کو دیکھنا چاہتے ہیں بس!"

جوں ہی پھاٹک کھلا، امیر خسرو بے تابانہ اندر داخل ہوئے سامنے ہی ایک خستہ حال مسافر پر نظر پڑی جو زمین پر بے خبر سو رہا تھا۔ اسکی طرف سے بوئے شیخ آرہی تھی جس نے خسرو کے سوز دروں کو دوچند کر دیا۔ تھا ؎

دل میں جو چوٹ تھی دبی ہائے غضب اُبھر گئی
پوچھو تو آہِ سرد سے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں

آپ نے بڑی آہستگی سے اُسے جگایا۔ آنکھیں کھولنے پر اپنے چاروں

طرف فوجیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ حواس باختگی کے عالم میں قبل اس کے کہ وہ بھی سرائے کے مالک کی طرح اپنی صفائی پیش کرتا۔ حضرت امیر نے اسے انتہائی نرم، شیریں، لطیف اور کریمانہ لہجے میں مخاطب فرمایا۔

"بھائی ہم تمھاری نیند میں خلل انداز ہوئے، معذرت چاہتے ہیں۔ دلِ نیاز پیشہ کے اضطراب مسلسل نے مجبور کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"حضور والا ہم دِلّی سے آرہے ہیں!"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم دِلّی میں بادشاہِ دین و دُنیا، سلطانُ المشائخ محبوبِ الٰہی سرکار نظام الدّین اولیاء کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے تھے تھیں اُن کی زیارت نصیب ہوئی تھی؟"

"جی ہاں! خاص کر ہم انھیں کی خدمتِ عالی میں ایک بڑا مقصد لے کر بڑی امیدوں کیساتھ حاضر ہوئے تھے۔ ان کی چارہ سازی دردمندی، بندہ نوازی، کرم فرمائی، دستگیری اور اندازِ مسیحائی کا بڑا شہرہ سُن کر۔ مگر اپنی زنگ آلود، مقفل قسمت کی کُنجی وہاں بھی نہیں ملی۔

ہائے وقت کی بے مہری، جس کی فیض وعطا، داد و دہش کا شہرہ برصغیر بھر میں پھیلا ہوا ہے، وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس ہو رہا ہوں ؎

اُمّید بھی اب ٹوٹی رستہ ہے نہ منزل ہے

"ایسا تو نہیں سکتا کہ ان کی بارگاہِ فیض وعطا سے کوئی ہاتھ خالی جائے۔ بالخصوص تم جیسا خستہ حال، غریب الدّیار آدمی، اپنی

پریشانی، خستہ حالی اور ضرورت کیسا تھ صورت واقعہ کی پُوری تفصیل بیان کرو۔"

"حضور والا! میں ایک پریشاں حال اور بے حد غریب آدمی ہوں حالات کی کڑی دھوپ نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ غریب اور بھی دُنیا میں ہوں گے مگر معاشی بدحالی نے مستقل مجھ سے دوستی کرلی ہے زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھینچ کھانچ کر عمر کی اس منزل تک لے آیا۔ میری حرماں نصیبی یہی نہیں کہ غربت نے مستقل میرے گھر پر ڈیرا ڈال رکھا ہے مزید برآں اس جانِ ناتواں پر جوانی کی پُرخطر دہلیز تک تلے اوپر پہنچنے والی سات جوانیوں کا بوجھ بھی ہے۔ ہم نے اب تک بڑے غم برداشت کئے۔ صدمات جھیلے، دُکھ کے بوجھ اٹھائے جو میری کربناک ماضی کا ایک حصہ ہیں۔ مگر سات جوانیوں کے بوجھ سے ابھی سے لرزہ براندام ہوں۔ میرا سکون غارت ہو چکا ہے۔ میری تمنّا تھی کہ میں اپنی بچیوں کی شادی سے سبکدوش ہو جاؤں مگر مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ میں اپنی ایک ہی لڑکی کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرّت سے ہمکنار کر سکوں ؎

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
کہ راستے میں کوئی نخل سایہ دار نہ تھا

انھیں ناتمام حسرتوں کو لیکر میں سُلطان الاولیا، سرکار محبوب الٰہی کی بارگاہ بندہ نواز میں حاضر ہوا۔ اپنی داستانِ الم گوش گزار کی جسے سُنکر آپ کی پلکیں نم آلود ہو گئیں، تسلّی کے کلمات خیر سے مجھے تسکین فرمائی اور ارشاد فرمایا کچھ دن میرے پاس رہ جاؤ، خدائے ذوالجلال بہتری کی کوئی صورت پیدا کرے گا۔

چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق میں آپ کے قدموں میں رہنے لگا۔ اس امید
قوی پر کہ یہاں تو ہر طرف سے فتوحات کا سیلاب آتا ہے جس سے خلق خدا سیراب
ہوتی ہے۔ میری بھی بگڑی کسی دن بن جائے گی۔ مگر ہائے رے برگشتگی
تقدیر! جس دن سے میرے منحوس قدم وہاں پڑے کہیں سے کوئی چیز آپ کی
بارگاہ میں آئی ہی نہیں کہ جس سے میرے درد کا درماں ہوتا۔

کچھ دن انتظار کے بعد بالآخر میں نے رخصت کی اجازت چاہی تو آپ
تڑپ اٹھے۔ ندامت بھرے انداز میں فرمانے لگے "اس فقیر سے بڑی امیدیں
وابستہ کرنے والے مہمان! میں تم سے شرمندہ ہوں کہ فی الحال میں تمہاری
کوئی خدمت نہ کر سکا اور حق میزبانی ادا نہ ہو سکا۔ بروقت تمھیں دینے کے
لیے کچھ نہیں ہے۔ البتہ ایک جوڑی پرانی جوتی ہے جو میری اپنی ملکیت ہے۔
اگر تم اسے قبول کر لو تو مجھے بڑی مسرت ہو گی کہ تم میرے یہاں سے بالکل
خالی ہاتھ نہیں گئے۔"

اسے میں نے اپنا نصیبہ سمجھ کر لے لیا اور وہاں سے چل پڑا۔

امیر و غریب، رئیس و فقیر، شاہ و گدا کو نوازنے والی بارگاہ سے
اپنی محرومی پر میں سخت اداس و غمزدہ ہوں۔ اپنی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ
لیکر میں بادشاہِ دین و دنیا کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اُن کی بارگاہِ فیض و عطا
سے ایک پرانی جوتی ملی۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب میرے مسئلے کا حل
کیا ہو گا۔ میرے نصیبے کی در بدری کب ختم ہو گی"؟ ؎

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

امیر خسرو نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "دوستو! کیا میں

نہیں کہتا تھا کہ اس سرائے میں ضرور کوئی خاص بات ہے جسے خسرو کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے "

" اجنبی مسافر! کیا تم اس مقدس نعلین کو جو سلطان المشائخ محبوب الٰہی سید نظام الدین محمد نے تمھیں اپنے کرم سے عطا فرمائی ہے، میرے ہاتھوں فروخت کرنا پسند کرو گے ؟"

سوال سے زیادہ لہجہ عجیب تھا۔ وہ چکرا کے رہ گیا۔ ایک ایسا شخص جو فوجی عہدیداروں میں نمایاں، ممتاز اور منفرد و معزز نظر آرہا تھا۔ فوجی جس کے سامنے مؤدب اور وہ خود ان کی نگاہوں میں محترم تھا! اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پرانی جوتی کو جو چلتے وقت سلطان المشائخ نے اسے عطا فرمائی تھی جس کے بارے میں ابھی تک وہ خود سنجیدہ نہیں ہو سکا تھا اس کو خریدنے کے لیے کوئی سوچے گا بھی!! جبکہ یہاں ایک بڑا محترم انسان اس کے خرید و فروخت کی بات بھی کر رہا ہے۔ ابھی وہ سوچ کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکا تھا کہ امیر خسرو کی دوبارہ آواز ابھری۔

خوش نصیب انسان! تم نے بتایا نہیں کہ اس قابل احترام جوتی کا تم کیا لو گے؟"

دوبارہ مخاطب کرنے پر وہ چونکا۔ آپ مذاق تو نہیں فرما رہے ہیں؟ بھلا آپ جیسا معزز آدمی پرانی جوتی کو لیکر کیا کرے گا؟ کسی بادشاہ یا شہزادے کی بھی نہیں کہ اس کے نقش و نگار میں کچھ سونے چاندی کی زری نکل آئے ایک دنیا بیزار درویش کی جوتی اتنی اہمیت تو نہیں رکھتی کہ آپ جیسا معزز انسان اس کو خریدنے کی بات کرے۔ اگر کسی طرح کا یہ انداز ستم ہے تو دکھوں کے ڈھیر میں ایک ہلکا اضافہ یہ بھی سہی کہ سہ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

استغفر اللہ معاذ اللہ انھیں کسی طرح کی تکلیف پہونچانا یا مذاق اڑانا میں گناہ سمجھتا ہوں۔ آخر تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں اپنی پیشکش میں مخلص ہوں۔ ویسے کوئی زور زبردستی نہیں، صرف گذارش ہے کہ وہ مقدس نعلین کو قیمتاً دیدو۔ جو بھی مناسب قیمت تم کہو گے میں دینے کو تیار ہوں آپ کے متین و سنجیدہ لب و لہجے سے اسے یقین ہو چلا کہ مجھ سے مذاق نہیں کیا جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے اٹکتے جھجکتے، صرف اتنا کہہ سکا "اس محترم انسان کی نعلین کی قدر و قیمت کا مجھے اندازہ نہیں۔ آپ جو بھی عطا فرمائیں گے ہم اسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیں گے"

سر دست میرے پاس صرف پانچ لاکھ تنکے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں کہ تمھاری ہی طرح میں بھی حالت سفر میں ہوں۔ اس حقیر اور معمولی رقم کے عوض اگر مجھے تم وہ قیمتی اور مقدس نعلین دے دو تو ہم تمھارے شکر گزار ہوں گے۔ آپ جذبۂ شوق میں بولے جا رہے تھے اور آس پاس کے لوگ عالم حیرت میں دم بخود۔ خود مسافر پر تو حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

امیر خسرو نے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں کذب یا مذاق کا شائبہ تک نہیں ہے ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

حیرت کا طلسم ٹوٹنے پر مسافر نے عرض کیا، حضور والا! اگر آپ اپنی اس پیشکش میں مخلص ہیں، جبکہ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں تمھاری ہی طرح مسافر ہوں تو اتنی بڑی رقم آپ حالت سفر میں کہاں سے لائیں گے؟"

"سب کچھ میرے پاس یہیں ہے۔ پانچ لاکھ تنکے خچروں پر لدے ہیں جو سرائے کے باہر کھڑے ہیں۔ یہ مقدس جوتی ہمیں دے دو۔ اس کے بدلے میں یہ دولت گھر لے جاؤ۔ بچیوں کی شادی کشادہ دستی سے کرو اور اپنی زندگی بھر کی محرومیوں کا ازالہ کرو"۔

مسافر تیزی کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا اور بڑی بے یقینی کے عالم میں خچروں پر لدی دولت کو دیکھنے لگا۔ جاگتی آنکھوں سے وہ خواب نہیں بلکہ زندگی کی ایک خوبصورت حقیقت دیکھ رہا تھا۔

"اب تو تمھیں یقین آگیا۔ جلدی بولو کیا کہتے ہو؟"

"حضور عالی! اب مجھے یقین آگیا۔ مگر میں یہ دولت کیسے لے جا سکتا ہوں؟ راستے میں چور، لٹیرے، ڈاکو ملیں گے، تنہا ایک میری جان۔ مال الگ لوٹ لیں گے، جان الگ جائیگی۔ میں پھر اسی طرح کنگال کا کنگال رہ جاؤں گا"۔

"فوج کی حفاظت میں دولت تمھارے گھر پہنچا دی جائے گی۔ بس اب تو مطمئن ہو۔ اب لاؤ جلدی کرو"۔

اس مفلوک الحال، غریب الدیار، اجنبی مسافر نے بھیگی پلکوں کے ساتھ مقدس نعلین کو چومتے ہوئے امیر خسرو کو پیش کیا۔ پھر گلوگیر آواز میں کہنے لگا "دلی پہونچ کر بادشاہ دین و دنیا، شہنشاہ فیض وعطا سے دست بستہ سلام کہیں، واپسی پر راستے میں بدگمان بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا کہ میرے سنگین مسائل کا حل کیا یہی پرانی جوتی ہے؟ غلام بہت شرمندہ ہے۔ میری طرف سے معافی بھی مانگ لیں۔ ہم جیسے کم نگاہ اور ظاہر بیں اس انداز مسیحائی کو کیا سمجھیں۔ جود وسخا فیض

وعطا کے بادشاہ کا انداز بخشش وعطا ہم گداگروں کے فہم وادراک سے بہت ماورا ہے

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

آپنے اس اجنبی مسافر سے پیرومرشد کے مقدس نعلین لیکر بڑے احترام وعقیدت کیساتھ چوما، آنکھوں سے لگایا، سر سے دستار کھول کر نعلین شریف کو اس میں لپیٹ کر سر سے باندھ لیا۔

جذبۂ شوق کا اضطراب لیئے کارواں کیساتھ منزل بہ منزل دلی کی طرف بڑھنے لگے۔ راستہ ہے کہ کٹتا ہی نہیں۔ زمین کی طنابیں جیسے سمٹنے کے بجائے پھیلتی جارہی ہیں۔ کبھی خوشی کے لمحات ابھی جانگسل ہوتے ہیں۔ بالآخر جذبۂ شوق کی گھما گھمی میں دلی پہونچ گئے۔ سب سے پہلے پیرومرشد نظام الحق والشرع والدین کی بارگاہ کرم میں حاضر ہوئے۔ قدموسی کی اور دست بستہ ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ آپ کے ارد گرد حاجتمندوں مرادیوں اپنوں بیگانوں سب کا مجمع لگا ہوا تھا۔ سلطان المشائخ کی آواز ابھری:

"خسرو! اقبال مند، عالی حوصلہ شہزادے کے ساتھ گئے تھے، فتح کی جلو میں واپس آئے تو میرے لیئے بھی کچھ لائے کہ بس خالی ہاتھ چلے آئے؟"

اگرچہ صورت واقعہ پورے طور پر آپ پر روشن تھی۔ لوگوں کے دلوں کے خطرات سے آگاہ رہنے والے سلطان المشائخ نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ خسرو کی بے پناہ محبت کا تماشہ لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں اور لوگوں پر ظاہر ہوجائے کہ اس ترک سے میری شدید وابستگی یوں ہے

نہیں ہے ؎

میں اِس عارفانہ تجاہُل کے صدقے
ہر اک دل کو چھیدا مرا دل سمجھ کے

نم آلود پلکوں سے عرض کرنے لگے۔ ایک غلام کی حقیقت ہی کیا جو سلطانِ فیض و عطا کو کچھ پیش کر سکے۔ ہاں حضورِ والا کے قدموں کی ایک نشانی اپنے سر کا تاجِ زرّیں بنا کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ میری حیات کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر اسے شرفِ قبولیت عطا ہو جائے تو میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہو گی۔ یہ کہہ کر دستار سر سے کھولی اور اس میں سے وہ بھی جوتی نکال کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دی۔

ارے! یہ تو میں نے ایک مفلوک الحال مسافر کو دیدی تھی۔ تمھیں کیسے ملی؟

جی ہاں قبلۂ عالم! یہ وہی مقدس نعلین ہے جسے ہم نے اس مسافر سے قیمتاً خریدی ہے

"خسرو! تم نے اس غریب آدمی سے کتنے میں خریدی؟ میں بھی تو کچھ سنوں۔ (تبسم زیرِ لب مچل رہا تھا)"

"حضورِ والا! پانچ لاکھ تنکے میں!"

"صرف پانچ لاکھ؟"

"جی سرکارِ والا تبار!"

"خسرو! بسیار ارزاں خریدہ (خسرو! تم نے بڑے سستے داموں خریدا)

"سرکارِ عالی! خسرو غریب بھی اس غریب کی طرح غریب الوطن تھا۔ مسافرت میں میرے پاس یہی سب کچھ تھا۔ اگر میں دلّی میں ہوتا تو اس کی بڑی سے بڑی قیمت دے سکتا تھا، امیر خسرو کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پیرو مرشد کے قدموں سے لگ کر عزت پا جانے والی جوتی کو اتنے کم داموں پر خرید کر

شرمندہ تھے ؎

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

خانقاہ میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ دم بخود تھے۔ یہ محبّت کیسی تھی؟ یہ کیسا عشق تھا؟ تڑپ کی یہ کون سی منزل تھی؟ چاہت کا یہ کیسا انداز تھا؟ جذبِ دروں کی یہ کون سی کیفیت تھی؟ ؎

یہ راز و نیازِ محبّت ہیں ناصح
نہ وہ بے خبر ہیں نہ ہم بے خبر ہیں

یہی جذبۂ سوز دروں تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے تھے "میں سب سے تنگ آجاتا ہوں یہاں تک کہ اپنے سے بھی۔ مگر اس ترک (یعنی خسرو) سے نہیں۔ اگر شرع اجازت دیتی تو ہم اور خسرو ایک ہی قبر میں آرام کرتے۔" ؎

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

خسرو سے حضرت محبوب الٰہی کی محبّت کا اندازہ اس سے لگائیے۔ فرماتے ہیں "کل میدانِ قیامت میں خدائے ذوالجلال نے مجھ سے پوچھا کہ نظام الدین دنیا سے میرے لیے کیا لائے؟" تو میں عرض کردوں گا "مولیٰ! میں تیرے لیے اس ترک کے سینے کا سوز لایا ہوں۔"

فرماتے ہیں "میں جنت میں اس ترک کے بغیر قدم نہیں رکھوں گا۔"

بلبلِ شیراز حضرت شیخ سعدی آپ سے ملنے ہندوستان آئے۔ حضرت خضر سے امیر خسرو کی ملاقات ہوئی۔ کلام میں شیرینی، لطافت، مقبولیت عام

کے لیے لعاب دہن کی درخواست کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔
"یہ سعادت حضرت سعدی حاصل کر چکے جوان کا مقدر رتھا۔ اب دوسرے کے لئے نہیں!" ـــ یہ سنکر آپ کو بڑا تکدّر رہوا۔ چہرے پر تکدّر کی کیفیت لئے قبلۂ عالم کی بارگاہ میں حاضری دی۔
"ترک کیا بات ہے؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"
"پیرو مرشد روشن ضمیر ہیں۔"
"تم بھی تو کچھ کہو"
"آج حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تھی۔ کلام میں شیرینی کے لئے لعاب دہن کی درخواست کی جو یہ کہہ کر مسترد فرمادی گئی کہ یہ شیخ سعدی کا نصیبہ تھا جو وہ حاصل کر چکے۔ اب دوسرے کے لئے ممکن نہیں۔
"بس اتنی سی بات پر منہ اتر گیا اچھا اپنا منھ کھولو"
خسرو نے اپنا منھ کھولا۔ آپ نے ان کے منھ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔
اس کی بدولت کلام میں وہی حلاوت، وہی لطافت، اور آپ کے کلام بلاغت نظام کو جو قبولیت عام کی سند ملی وہ صبح قیامت تک کے لیے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بیعت میں انفرادیت

والد محترم ابتدائی عمر ہی میں لے کر سلطان الاولیاء، سرکار محبوب الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تاکہ دامن کرم سے وابستگی کا اعزاز مل جائے۔ جب خانقاہ کے دروازے پر پہونچے تو والد گرامی سے کہنے لگے، آپ اندر جائیے۔ میں یہیں باہر بیٹھتا ہوں بغیر بلائے نہیں جاؤں گا۔
دراصل بچپن ہی میں بیعت میں انفرادیت چاہتے تھے ـــ

والد ماجد اندر جا کر خاموشی کیساتھ بیٹھ گئے۔ امیر خسرو نے باہر بیٹھے بیٹھے ایک رُباعی نظم کی جسے زیرلب آہستگی سے گنگنانے لگے ؎

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

تو ایسا بادشاہ ہے کہ تیرے قصر کے کنگورے پر اگر کبوتر بیٹھ جائے تو وہ بھی باز بن جائے۔ ایک غریب حاجتمند تیری چوکھٹ پہ حاضر ہوا وہ اندر آئے یا باہر ہی سے واپس چلا جائے۔ یہ سوچ کر کہ اگر شیخ کامل ہیں تو اُن کی نگاہ دلوں کے خطرات پر بھی ہوگی۔ پھر اگر انھوں نے مجھے اپنی غلامی میں لینے کے قابل سمجھا تو ضرور اندر بلائیں گے اور اگر انھوں نے نہیں بُلایا تو ایسے ہی بغیر ملے واپس چلا جاؤں گا کہ وہ مرشد کامل ہی کیا جو دلوں کی دھڑکنوں سے باخبر نہ ہو سکے۔ ابھی اس غور و فکر میں تھے کہ سُلطان الاولیاء نے اپنے خادم خاص سے مسکراتے ہوئے فرمایا :۔ دروازے کے باہر ایک لڑکا بیٹھا ہوگا اس کے سامنے یہ رُباعی پڑھ کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے آؤ ؎

بیاید اندروں مردِ حقیقت
کہ با مایک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

چاہئے کہ اندر آئے وہ مردِ دانا کہ میرے ہمراہ بیٹھ کر میرا ہمراز ہو جائے اور

اگر وہ مردِ احمق و ناداں ہے تو اسے چاہیے کہ جس راستے سے آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے۔

اتنا سننا تھا کہ انتہائی بیتابی کیساتھ اندر داخل ہوئے۔ پیر و مرشد کے قدموں پر سر رکھا اور جانِ بے تاب کو ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے کر دیا

تقریبِ محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی
جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہ جبیں واقف

یوں تو سلطان الاولیا، خیر الاذکیا، امام الاصفیا حضرت سیدنا و مولانا محمد نظام الحق والشرع والدین کے دامنِ کرم سے وابستہ ہو کر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حضرت برہان الدین غریب، حضرت قطب الدین منور، علامہ فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا شمس الدین یحییٰ، سید نصیر الدین چراغ دہلوی، اخی سراج بنگالی، مولانا حسام الدین ملتانی وغیرہم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم و فضل، زہد و ورع تقویٰ و طہارت، جذب و سلوک، اعتماد و یقین، توکل و استغنا میں ہمیشہ بے مثال تھے۔ ان نفوسِ قدسیہ کو بارگاہ سلطان الاولیاء میں بڑا قرب حاصل تھا۔ وہ خلافت و اجازت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انھیں میں "حضرت خسرو" بھی تھے۔ مگر ایک انفرادی شان لئے ہوئے۔ مزاج اقدس میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں اہم ترین معاملات میں خسرو سفارشی ہوتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سلطان الاولیا، سرکار نظام الحق والشرع والدین نے ان کی عرض داشت کو رد فرمایا ہو۔ وہ اپنے ترک (خسرو) کا ناز اٹھاتے تھے۔ ہر نازک موڑ پر آپ نے خسرو کے بجا اعتماد کی لاج رکھی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے دو خاص درباری ۔ ملک نصرت ، اور محمد علی زنبیلی جو سلطان الاولیاء کے مرید بھی تھے ۔ انھوں نے پیرو مرشد سے حضرت برہان الدین غریب کی شکایت کر دی ۔

" حضور اب آپ کی بارگاہ کے تربیت یافتہ آپ کی صحبت یافتہ مخصوص خلفاء میں بھی تن آسانی اور عیش پسندی آتی جا رہی ہے ۔ ابھی سے شیوخ کے طریقے پر سجادگی پر بیٹھنے کی مشق شروع ہو گئی ہے "

" کیا کہہ رہے ہو تم لوگ !! وہ کون لوگ ہیں ؟ ..

" حضور والا ! ہم بالکل درست کہہ رہے ہیں اب یہی برہان الدین غریب کو لے لیجئے ۔ دیکھنے میں بالکل مسکین صورت ۔ نیک نفس ، شریف النفس عبادت گذار ، صاحب تقویٰ اور آپ کے خاص غلاموں میں سے ہیں ۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک کمبل کو تہ در تہ کر کے اسے اونچا کرتے ہیں ۔ پھر مشائخ کے طرز پر اس پر تشریف رکھتے ہیں ۔ بھلا ان کو ابھی سے ایسا کرنے کی ضرورت تھی ؟ وہ پیرو مرشد تو نہیں ہو گئے کہ انداز نشست کو اس طرح سے اپنائیں اور سجادۂ شیخی پر بیٹھیں ۔

یہ سن کر سلطان الاولیاء کے مقدس چہرے پر رنج و ملال ظاہر ہوا فوراً خادم خاص کو بلایا ۔ " اقبال "!

جی حضور !

" دیکھو خانقاہ میں برہان الدین غریب بیٹھے ہوں گے ان سے کہو کہ وہ یہاں سے فوراً اپنے گھر چلے جائیں اور اب ان کو یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہاں میرا خلافت نامہ بھی واپس لے لینا

سخت وحشت کے عالم میں خادم خاص ، اقبال غریب کے پاس

گیا۔ اِس غریب کو اس غریب پر ترس آرہا تھا۔ بیچارے سیدھے سادھے نیک خداترس سوکھی ہڈیوں کا مجموعہ غریب! وَاقعی غریب ہو چکے تھے۔

جھجھکتے اٹکتے خادم کہنے لگا۔ جناب عالی! سرکار کا حکم نامہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔

سراپا اِشتیاق بن کر: "کیا حکم ہے آقا کا؟"

آپ اپنا خلافت نامہ واپس کر کے ابھی خانقاہ سے چلے جائیں اور پھر اب یہاں مت آئیں۔ یہ حکم سناتے ہوئے حقیقتاً بہت افسوس ہو رہا ہے۔ ملک نصرت اور علی زنبیلی حضرت کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہی کچھ لگائی بجھائی ہے۔

اتنا سنتے ہی غریب بَدحواس ہو گئے۔ خرمن آرزو پر بجلیاں گر پڑیں گریۂ بے اختیار نے آنکھوں کو ساون بھادوں بنا دیا۔ آہ! میں تباہ و برباد ہو گیا۔ مرکزِ حیات ہی جب روٹھ گیا تو اب زندگی کس کام کی؟

برستی آنکھوں سے خلافت نامہ واپس کیا، کمبل کاندھے پر رکھا اور لرزیدہ قدموں سے اپنے حجرے کی طرف چل دیئے۔ اب صرف وہ تھے اور ان کی گریۂ تنہائی! ؎

سوکھی ہیں بہت دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو دل بھر کے رُلائے کوئی آکر

دَربار سرکار سے فرصت پا کر کئی دن کے بعد خسرو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں پہونچے۔ سب نظر آئے مگر "غریب" نہیں۔ موقع پاتے ہی خادم خاص سے پوچھا۔

"اقبال: غریب کہاں ہیں؟"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ابھی کچھ نہیں معلوم !!!"

"ارے بھائی پہیلیاں مت بجھاؤ! کیا کوئی حادثہ پیش آگیا اس کو؟"

"حادثہ سے بڑھ کر! پیر و مرشد نے انھیں خانقاہ سے نکال دیا۔ اپنا خلافت نامہ بھی واپس لے لیا اور خانقاہ میں آنے پر پابندی لگا دی۔"

"آخر کیوں؟"

"یہ ملک نصرت اور علی زنبیلی کی شرارت ہے۔ وہ کبل تہ کرکے خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ اس کے متعلق کچھ لگائی بجھائی کرکے پیر و مرشد کو ناراض کیا ہے۔ اب وہ کہیں نکلتے بھی نہیں۔ بس اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ گھر کے اندر اکثر روتے رہتے ہیں۔ سب لوگوں کو اس حادثہ کا بڑا قلق ہے۔ لیکن حضور کی بارگاہ میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ ہی پر سب کی نگاہیں ہیں ؎

خدا گواہ بھری انجمن میں میرے سوا
نہیں ہے کوئی جو ان کی نظر کو پہچانے

امیر خسرو "غریب" کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا، جیسے ہی خسرو پر نظر پڑی، دوڑ کر لپٹ گئے۔ کہاں تھے میرے بھائی! میرے دوست! یہاں مجھ پر کئی قیامتیں گذر گئیں اور تم اب آرہے ہو۔

"غریب! میرے بھائی۔ تم گھبراؤ نہیں اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ملک نصرت اور زنبیلی کی شرارتوں کا علم ہو چکا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو، میں معافی دلوا دیتا ہوں۔"

"نہیں خسرو! نہیں! میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ ناراضگی کے عالم میں قبلۂ عالم کا سامنا کروں۔"

"ارے بھائی تم چلو تو سہی۔ تمھیں کون کہتا ہے کہ تم سیدھے حضرت کے روبرو کھڑے ہو جاؤ۔ تمھیں حضرت کے سامنے اس وقت پیش کروں گا جب وہ تم سے راضی ہو چکے ہوں گے۔"

دونوں ساتھ ساتھ حضرت سلطان الاولیاء کی خانقاہ میں آئے۔ غریب کو خسرو نے ایک گوشے میں بٹھا دیا اور خود ننگے سر، ننگے پاؤں، دستار گلے میں لپٹی ہوئی عفو و تقصیر کے لئے مجرمانہ انداز لئے حاضر ہوئے۔ خسرو کو اس انداز میں دیکھ کر آپ تبسم ریز ہوئے ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

"ترک کیا بات ہے؟"

"بندہ پرور! غریب کی خطا معاف کر دی جائے!"

"غریب کا قصور تمھیں معلوم ہوا؟"

"جی میرے آقا! وہ گناہ بے گناہی کا مرتکب ہوا۔"

"یعنی وہ تمھاری نگاہوں میں بے قصور ہے۔ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دی گئی ہے؟"

"وہ صفائی کی جرأت نہ کرسکا۔ ورنہ حضور کی نگاہوں میں بھی بے قصور ہوتا۔"

"تو اس کی طرف سے تم صفائی پیش کرنے آئے ہو؟"

"نہیں اس کی طرف سے خطا کی معافی چاہنے آیا ہوں۔"

"جب خطا ہی نہیں تو معافی کا کیا سوال؟"

"اس کے گناہ بے گناہی کی یہی تفصیل تو حضور والا کی بارگاہ کرم

تک پہونچی ہے کہ بُرہان الدین کمبل تہ کر کے مشایخ کے طریقے پر ابھی سے بیٹھتا ہے ۔ بے شک وہ برہان الدین کمبل تہ کر کے اس پر بیٹھتا ہے مگر مجبور ہو کر! آپ کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خانقاہ عالیہ میں سوکھی ہڈی کے پنجر کا نام " برُہان الدّین غریب " ہے خصوصًا اس کے پاؤں کی ہڈیاں کس قدر سوکھی ہیں! اپنے پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کی وجہ سے وہ ننگے فرش پر نہیں بیٹھ پاتا! بس اتنی سی بات کو ہمارے پیر بھائیوں نے افسانہ بنا دیا ۔"

" اچھا! لیکن وہ دکھائی بھی تو نہیں دیتا ۔ آخر کہاں رہتا ہے ؟ "

" ابھی حاضر کئے دیتا ہوں ۔

غریب قدموں پر آ کر گر پڑے ۔ سرکار عالی نے سینے سے لگا لیا ۔ سینے سے لگاتے وقت ایک غریب کو سلطان فیض وعطا نے جو کچھ عطا فرمایا اسے فورًا دنیا نے دیکھ لیا اور آج سات سو سال سے زیادہ ہوا ۔ دنیا دیکھ رہی ہے ۔ سینے سے لگانے کے بعد نئے سرے سے اجازت وخلافت عطا فرمائی ۔ کچھ دنوں کے بعد دولت آباد (دکن) کی طرف مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا ۔ آپ نے وہاں پہونچ کر سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو وہ نقطۂ عروج عطا فرمایا کہ ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خلقت اس قدر رجوع ہوئی اور ولایت کا آوازہ اس قدر بلند ہوا کہ آپ کے نام پر برُہان پور شہر آباد ہوا ۔ وہی برہان پور جو دو سال تک عادل شاہی حکومت کا پایۂ تخت رہا ۔ جسے مدینۃ الاولیا ۔ دارالسرور برہانپور شریف بھی کہا جاتا ہے جو مدھیہ پردیس کا ایک عظیم تاریخی شہر ہے ۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں اس سے وابستہ ہیں ۔ اسی لیے اس شہر کی تعمیر و ترقی ۔ تنگ نظری وعصبیت کا شکار ہے ۔ ورنہ اس کے مقابلے میں

کھنڈر وہ جو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، اسے تعمیر و ترقی کے آسمان پر پہونچایا جا رہا ہے۔ لیکن بیچارہ بربان پور جو ایک عظیم قوم کی داستان عظمت و جلال سے منسوب ہے۔ اس کے ساتھ سوتیلا سلوک برتا جا رہا ہے ؎

پڑی ہے لاش تعصب کی دورا ہے پہ مگر
اک جنازہ ہے جو قوموں سے اٹھائے نہ بنے

امیر خسرو کون تھے؟

وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین سمرقند کے قریب "شہر کش" جو بہت بعد میں شہر "سبز" کہلایا۔ جسے امیر تیمور کے شہر سبز سے زیادہ شہرت ملی۔ وہ چنگیزی حملوں کے درمیان وطن سے بے وطن ہو کر بلخ میں آبسا۔ سنہ ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں کا ایک زبردست لشکر خود چنگیز خاں کی قیادت میں سمرقند و بخارا کو تباہ و برباد کرتا ہوا بلخ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو مسجدوں والے اس عظیم اسلامی شہر میں ایک سال بعد کوئی دیا جلانے والا نہیں رہ گیا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کی ایک شاخ "ہزارہ" کے سردار تھے حملے کے وقت بلخ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ عالم اسلام پر چنگیزی عتاب نے ہندوستان کو پناہ گزینوں کا مسکن بنا دیا تھا۔ ادھر کے اجڑے ہوئے بہترین شہسواروں، مدبروں، دانشوروں اور اصحاب علم و فضل کے لئے بالغ نظر درویش صفت بادشاہ شمس الدین التمش کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ انھیں پناہ گزینوں میں سیف الدین محمود بھی تھے۔ ابتدائی چند سال معمولی خدمتوں میں گزرے۔ بعد میں انھیں متھرا سے ایٹہ جانے والی شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی عرف مومن آباد قصبے میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا ہوئی۔ سیف الدین محمود کی شادی ایک ہندوستانی امیر عماد الملک کی بیٹی دولت ناز ہوئی

چار بچے یعنی ایک بیٹی، تین بیٹے تولد ہوئے۔ یمین الدین محمود ان میں منجھلے تھے جو ۱۲۵۲ء ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے جو اپنے تخلص اور موروثی خطاب "امیر" کی بدولت "امیر خسرو" کہلائے۔ امیر خسرو کی شہرت اتنی ہوئی کہ اصل نام دب گیا۔

اس مختصر توضیح سے معلوم ہوا کہ آپ ہندی الاصل تھے۔ جیسا کہ آپ کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارد کز عرب گویم سخن

آٹھ سال کی عمر میں پدر بزرگوار کی شفقتوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا امیر عماد الملک نے آپ کی خصوصی تربیت و پرورش کی۔ عماد الملک حکومت وقت کے چار بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ ۷۰ سال عارض ممالک (سکریٹری محکمۂ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو دو ہزار پیدل غلام، ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ پچاس آدمی تو صرف ان کے پاندان، خاصدان پر ملازم تھے۔ بڑے مخیر، سخی حاتم تھے۔ ایسے صاحب حشمت و منصب و جاہ کے نواسے...... یمین الدین خسرو محمود تھے۔

بیس سال سے کم عمر میں انھوں نے ایک دیوان "تحفۃ الصغر" لکھا، اور عمر کی بیسویں بہار پر پہونچ کر جب وہ کسب معاش اور فکری روزی میں نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک بہترین دیوان ان کے ساتھ تھا۔ عملی زندگی میں سب سے پہلے سلطان بلبن کے شاہ خرچ بھتیجے علاء الدین کشلو عرف ملک چھجو کی ملازمت اختیار کی۔ دو برس وہاں رہ کر سلطان بلبن

بیٹے بغرا خاں سے شناسائی حاصل کی۔ بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا (جسے بعد میں ریاست پٹیالہ کہا گیا) امیر خسرو علاء الدین کشلو کی ملازمت چھوڑ کر بغرا خاں کے پاس سامانہ آگئے۔ ناصر الدین بغرا خاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنا لیا یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی اور اس کے لوک گیتوں کی لے -!

۱۲۷۹ء میں حالات نے انھیں بنگال کے صدر مقام لکھنوتی پہونچا دیا۔ مگر وہاں آپ زیادہ دن نہ رہ سکے، واپس دلّی آگئے۔ سلطان بلبن کے سپہ سالار و ولی عہد بیٹے سلطان محمد قاآن سے رابطہ قائم کیا۔ ۱۲۸۰ء میں شہزادے کی خدمت میں ملتان حاضر ہوئے، کلام سنایا۔ اس قدر پسند کیے گئے اور اس انداز میں پذیرائی ہوئی جو خسرو کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

پنجاب، سندھ دونوں کے لیے ملتان فوجی چھاؤنی تھا۔ علماء، شعراء، ادباء، اولیاء، اصفیاء، اتقیاء کا گڈھ۔ اس کے علاوہ عراق، عرب کے موسیقاروں کا جمگھٹا تھا۔ شہزادہ سلطان محمد قاآن ذی علم، صاحب فکر و نظر، بہادر، فیاض، شاعری و موسیقی کا دلدادہ، شمشیر و سنان، طاؤس و رباب دونوں میں بے مثل تھا۔ اس کا دربار خسرو کیلئے بہترین تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر خسرو نے اپنا دوسرا دیوان "وسط الحیوۃ" ترتیب دیا۔ یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو موسیقی سے جوڑا جسے بعد میں قول قلبانہ سے شہرت ملی۔ یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوک گیتوں کے لئے استعمال کیا۔ یہیں انھوں نے عربی و فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور بتیس[۳۲] قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے جواب تک کسی کے لئے نہیں لکھے تھے۔ پہلی بار انھیں ایک لائق، بہادر، فیاض، سیر چشم، جوہر شناس، قدرداں ممدوح ملا تھا۔ منگولوں

کے ساتھ ایک زبردست معرکے میں سلطان محمد شہید ہو گیا۔ خسرو بھی گرفتار ہوئے مگر بہزار خرابی بسیار وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ واپس دہلی آ گئے۔ کچھ دن وہاں رہ کر ماں اور عزیزوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن پٹیالی آ گئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ مگر دلی کے درباری حالات پر برابر نظر رہی، امراء کی سازش، سیاسی داؤں وپیچ، حالات کے اتار چڑھاؤ سے برداشتہ خاطر ہو کر امیر علی مرجاندار حاتم خاں سے وابستہ ہو گئے۔ دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا، اودھی بول چال، وہاں کی اپنی لوچ دار تہذیب، مخصوص انفرادیت، نفاست، نزاکت تو بہت پسند آئی مگر زیادہ دن دلی سے دور نہ رہ سکے۔

جیسے ہی دلی پہونچے، سلطان معزالدین کیقباد نے بلا بھیجا۔ خاطر خواہ قدر افزائی کی۔ تین ہزار نو سو چوالیس اشعار پر مشتمل مثنوی "قران السعدین"، چھ ماہ کے بعد مکمل کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ مثنوی کئی حیثیتوں سے نہایت ہی اہم ہے۔ باپ بیٹے کی تاریخی ملاقات جو قتل وغارت گری کے بجائے شفقت ومحبت میں بدل گئی۔ خسرو اس کے چشم دید گواہ تھے۔ سلطان نے جی کھول کر داد دی۔ خوب انعام واکرام سے نوازا اور ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا۔

معزالدین کیقباد کے بعد جوڑ توڑ کی سیاست نے عنان حکومت جلال الدین خلجی کو دی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں خسرو مقرب بارگاہ سلطانی تھے۔ یہاں تک کہ فوجی مہمات میں بھی ساتھ ساتھ رہتے۔ اس کی جنگی مہموں کی یادگار میں ایک مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کا عہد اس حیثیت سے خسرو کے لیے بڑا مبارک رہا کہ

اس کے مختصر عہدِ حکومت میں خسرو کو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں زیادہ سے زیادہ موقع حاضری کا نصیب ہوا اگرچہ حضور محبوبِ الٰہی کی غلامی میں عہدِ طفلی ہی سے آگئے تھے مگر کسبِ معاش اور دربار سرکار سے انھیں ایسے مواقع کم میسر ہوئے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں آپ نے اپنا سب سے اہم دیوان "غرۃ الکمال" اپنے صاحب نظر اور بزرگ دوستوں کے مشورے پر ترتیب دیا۔ یہ پہلا دیوان تھا جسمیں حمدِ الٰہی و نعتِ مصطفائی کے بعد بادشاہ کی تعریف سے پہلے اپنے پیرو مرشد سلطان الاولیاء حضرت سید نظام الدین محبوبِ الٰہی کی مدح فرمائی۔

۱۶ رمضان المبارک ۶۹۵ھ بروز بدھ، بوڑھے، نرم رو، نرم خو، کرم کشا، رحمدل، چشم پوش، کشادہ دل، کشادہ مزاج، کشادہ ظرف، خوش مزاج، خوش خصال، خوش اطوار بادشاہ سلطان جلال الدین خلجی کو اس کے سگے داماد، سگے بھتیجے، اور پروردۂ نعمت نے دھوکے سے قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اس نے اپنے پیش رو معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے برعکس بلبن کی سخت گیر، بے لوچ اور غیر شاعرانہ پالیسیوں کو اپنایا اور بیس سال تک بڑی شان و شوکت، بڑے کروفر، بڑے جاہ و جلال اور شاہانہ طمطراق سے حکومت کی اور اپنے عزم و یقین، فاتحانہ حوصلے اور زبردست تسخیری قوت کی بدولت وہ ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا۔

ایسے سخت گیر، کھردرے اور غیر شاعرانہ مزاج رکھنے والے بادشاہ کے یہاں بھی خسرو کا منصب و وظیفہ برقرار رہا۔ اس نے خسرو کو اپنی درباری زینت بنائے رکھا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا۔

اپنے اور سلطان المشائخ کے درمیان انھیں رابطے کی ایک کڑی سمجھتا۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ سے خسرو ہی کے ذریعے رابطہ قائم رکھتا اور ہر کڑے وقت اور کڑی آزمائش میں آپ کی دعاؤں کا طالب رہتا۔

دورِ علائی آپ کی شاعری کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے عہد میں کئی مثنویاں اور خمسے لکھے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں اسی عہد یعنی ۱۲۹۹ء کی یادگار ہے۔ عہدِ علائی کو بارہ ۱۲ برس تک پرکھنے کے بعد اپنے قلم کا پہلا نثری سرمایہ "خزائن الفتوح" لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ علاء الدین خلجی کے دور کی شمالی و جنوبی فتوحات کی ایسی منھ بولتی تصویر ہے کہ اس کا نام ہی "تاریخ علائی" پڑ گیا۔

عہدِ علائی ہی میں آپ نے سلطان المشائخ کے اقوال کو "افضل الفوائد" کے نام سے قلمبند فرمایا۔ جو آج تصوف کی راہ کا سنگِ میل ہے اور نفحات الانس، فوائد الفواد، سیر الاولیاء، تذکرۃ الاولیاء، طبقات الاولیاء، اخبار الاخیار اور تاریخ فرشتہ وغیرہم ہی کی طرح ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضخیم نثری تصنیف "رسائل الاعجاز" بھی دورِ علائی ہی کی دین ہے۔

پھر ہندوستان کی بساطِ سیاست پر نئی چالیں چلی گئیں۔ ادھر قصر ہزار ستون میں علاء الدین نے جانِ جان آفریں کے سپرد کی ادھر سازشیوں کی چال نے اس کی مضبوط ترین حکومت کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیئے۔

علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر نوجوان بادشاہ نے عیش و طرب، ظلم و بربریت، سفاکی و خونریزی، اپنوں کو دشمن بنانے کے علاوہ ایک بے حد طرحدار حسین، رعنا اور خوبصورت، یادو قبیلے کے حسن نامی نوجوان کے ساتھ عشق نہیں ہوس

رانی اور اس کے ساتھ عیش وطرب میں بڑا بدنام ہوا۔ بالآخر، مئی ۱۳۲۰ء مطابق ۷۲۰ھ جمادی الثانی کی چاندرات کو اپنے اسی شریک بزم عیش و نشاۃ کے ہاتھ بیدردی سے قتل ہوا۔ خاندان خلائی کے کمسن بچوں تک کو چن چن کر قتل کر دینے کے بعد خسرو خاں کے لقب سے تخت نشین ہوا پھر تو اضطراب و بے چینی کا ایک نیا دور شروع ہوا بالآخر تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ غازی ملک تغلق نے سخت خونریزی کے بعد اسے شکست دے کر قتل کیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

خسرو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ دربار تغلق کی زینت بن گئے اور وہ بلبل ہزار داستان، وہاں بھی نغمہ سنج ہوا۔

تاریخ کا یہ اجمالی پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ خسرو کی عظمتوں کے نقطۂ عروج کا پس منظر سمجھ میں آجائے۔ سات بادشاہوں کے درباری شاعر، ان کے مزاج میں اثر و رسوخ رکھنے والے اتنی عظمتوں، رفعتوں اور آفاقی شہرتوں کے حامل خسرو سلطان الاولیا، سرکار محبوب الٰہی کے بندۂ بے دام تھے۔

سلطان الاولیا، ہر ایک کو بے حیل و حجت شرف بیعت سے نوازتے دامن محبوبیت ہر ایک کے لئے کشادہ تھا۔ سیہ کار، گنہ گار، نیکو کار، امیر، غریب، فقیر، رئیس، درویش سب ان کے دامن کرم سے وابستہ ہوتے خسرو عشاء کی نماز کے بعد حاضر بارگاہ ہوتے۔ شہر بھر کی خبریں اور درباری حالات سناتے۔ اس کے بعد محفل سماع منعقد ہوتی سلطان المشائخ کی طرف مخلوق کا بے پناہ رجوع اور ہر دلعزیزی، حکومت اور بادشاہ سے بے تعلقی بے نیازی اور حاسدین کی لگائی بجھائی سے غیاث الدین آپ سے بدگمان

ہوا۔ ایکبار حکم دیا کہ آپ دربار میں آکر سماع کے متعلق وضاحت کریں۔ علمائے دین کی طرف سے اعتراض ہو رہا ہے۔ آپ اپنے خدام اور رفقاء کے ہمراہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ کتابی علماء اور بادشاہ کو بدلائل احسن مطمئن کیا۔ بادشاہ نے واپسی کی اجازت میں نہ تو سماع کے متعلق کچھ منع کیا اور نہ ہی کھلی چھوٹ دی مگر اس قدر باوقار و بے نیازانہ انداز میں آپ کا بادشاہ کے دربار سے واپس آنا اسے بہت کھل گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ناگواری، سوئے ظن و حسد کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ بالآخر جلاپا اتنا بڑھا کہ ۱۳۲۴ء میں بنگال کی مہم پر جاتے وقت کہلوا بھیجا کہ میری واپسی تک دلی چھوڑ دیں۔

اس مہم میں خسرو بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ بنگال سے واپسی میں پھر ایکبار قاصد بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے پہلے دلی چھوڑ دیں آپ کے خدام و اہل محبت میں تشویش و اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر آپ بڑے پرسکون تھے بڑے اطمینان بھرے لہجے میں فرمایا "ہنوز دلی دور است"۔ (ابھی دلی دور ہے) یہ تاریخی جملہ بعد کو کہاوت بن کر آپ کی خدارسیدہ زبان حق ترجمان سے نکلا تھا جو بے ادب، بدنصیب تغلق کی تقدیر بن گیا ؎

گفتہ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

غیاث الدین تغلق کو دلی آنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ۱۳۲۴ء کی آخری تاریخوں میں دلی شہر سے باہر بیٹے نے باپ کے استقبال و اعزاز کے لیے ایک لکڑی کا شاندار محل بنوایا۔ سعادتمند بیٹے نے فتحمند باپ کا اسی طرح استقبال کیا۔ باپ نے بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اسی رات محل کی چھت زمیں بوس ہوئی۔ غازی ملک تغلق اپنے انجام کو پہونچا۔ اللہ کے ایک

برگزیدہ بندے کی دلآزاری کی اسے بڑی قیمت دینی پڑی ؎

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۶ / ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو سلطان المشایخ سیدنا سرکار محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء نے اپنے سب سے زیادہ صاحبِ تقویٰ مرید و خلیفہ حضرت سید نصیر الدین چراغ محمود کو خلافت و جانشینی عطا فرماکر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت امیر خسرو اس وقت بادشاہ کے ہمراہ بنگال میں تھے۔ جوں ہی یہ خبر وحشت اثران تک پہونچی، حواس باختہ ہوگئے۔ ملازمت سے استعفاء دیدیا۔ بھاگم بھاگ دلّی پہونچے، زار و قطار روتے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آفتاب زیرِ خاک سو گیا اور خسرو ابھی زندہ ہے۔ سر کو پتھروں سے ٹکراتے رہے ؎

اَب ہم ہیں اور ماتم ایک شہرِ آرزو!
ٹوٹا وہ آئینہ کہ جو تمثال دار تھا

یہی کیفیت چھ ماہ تک رہی۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ تن کی خبر۔ دن رات روتے رہتے۔ اکثر رات کو اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ دیکھنے والوں کو ترس آنے لگتا۔ ٹھیک چھ ماہ بعد اسی دن اسی تاریخ کو قبرِ انور پر سر رکھا، سرد آہ کھینچی، زور سے یہ دوہا کہا ؎

گوری سوئے سیج پر منہ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

اور جان جاں آفریں کے سپرد کردی ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ٭ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پوری دنیا ایسی محبت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ محبت ہی کی جلوہ آرائی تھی کہ حضرت سلطان الاولیا، فرمایا کرتے تھے جسے میری قبر پر آنا ہو تو خسرو کی قبر پہ حاضری دے۔ سات سو سال سے زائد ہو گئے، یہ رسم جاری ہے۔ عوام و خواص سبھی پہلے خسرو کی بارگاہِ عشق میں حاضری دیتے ہیں۔ اس کے بعد محبوبِ الٰہی کی چوکھٹ کو چومنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق :- "خسرو جیسا انسان آج تک خاکِ ہند پیدا نہ کر سکی" ؎

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے

بزبانِ حکایت

شہزادی

جمال وزیبائی اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ حیا آلود انداز لیے جب دوشیزگی کے پیکر میں ڈھلتی ہے تو ماحول کو سرگوشیوں کی زبان مل جاتی ہے۔ حمیدہ اوصاف پاکیزہ صفات کی اضافی خوبیاں اور معنوی تقدس، تابانی حسن اور رعنائی، شباب کی سحر آفرینی اس کی تسخیری قوت کو دوچند کر دیتا ہے۔ کرمان شاہ کا وہ گل رعنا، نسوانی وقار کی آبرو اور اس کے حسن کا نمائندہ و ترجمان بن کر جب شباب کی دہلیز پر پہونچا تو آبشاروں کا ترنم، نغمہ بار غنچوں کا تبسم مشکبار پھولوں کی نزاکت شرمسار اور کہکشاں کا جمال ڈھنگ رنگ ہو گیا ؂

رُخ ہے تاباں زلف مشکیں قامت رعنا تیرا

سرو ہے، سنبل ہے اور خورشید عالمتاب ہے

ایران میں دشت لوط کے مشرقی جنوب میں کرمان شاہ نامی جگہ آج بھی موجود ہے، دو صدی ہجری (سـ۲ـھ) میں وہاں پر شاہ شجاع کی حکومت تھی۔ جوان رعنا شہسوار، بہادر سیر و شکار کا رسیا، عیش و طرب کا دلدادہ، فکر امروز سے دور، اندیشہائے فردا سے بے نیاز، گھوڑ سواری میں اس قدر ماہر کہ ابو الفوارس اس کا لقب۔

اس کے عیش و طرب کا سلسلہ دن رات یونہی جاری تھا۔ حیات

اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ ایسے تنگ دامن میں زندگی کی تمام مسرتیں سمیٹے ہوئے تھا۔ سیر و شکار ہی اس کے حیات کا حاصل تھا گویا وہ ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کی عملی تفسیر تھا کہ اسی اثنا میں اس پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، روح کی بہاروں کا موسم آیا۔ گل قدس کی خوشبو اڑی، اس کے روح کی ارجمندی کے نقطۂ عروج کا آغاز اس طرح ہوا کہ دوران شکار ایک مرد غیب کی ہلکی سی تنبیہ نے اس کے کائنات دل کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اس کا دل دنیا کی رنگینیوں سے اس طرح اچاٹ ہوگیا کہ وہ فوری طور پر تخت و تاج سے دستبردار ہونے کا اہم ترین فیصلہ کر ڈالا۔ گھر پہونچتے ہی اہل خاندان کو اکٹھا کیا اور ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔" پورے خاندان اور محل میں اس فیصلے سے کھلبلی مچ گئی۔" ہزار دباؤ، ہزار فہمائش، منت و سماجت، الحاح و زاری کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا ؎

اٹھتی نہیں نگاہ کسی اور کی طرف
پابند کر گئی ہے کسی کی نظر مجھے

چھوٹے بھائی نے بڑے ادب سے عرض کیا" بھائی جان! عجلت میں کوئی فیصلہ اور وہ بھی اتنا بڑا دیرپا نہیں ہوتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنے اس فیصلے پر افسوس کرنا پڑے۔ اس لئے جلدی نہ فرمائیں، کچھ دن رک کر خوب غور و خوض کر لیں۔" " جان برادر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ عمر کا اتنا قیمتی حصہ ضائع ہو گیا۔ حیات مستعار کی چند سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں کیا پتہ وہ کب ٹوٹ جائیں۔ اور ابھی ہم نے

اپنی آخرت کے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ تم تخت و تاج سنبھالو، یہ تمھیں کو مبارک ہو۔ اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ پھولوں کا یہ سیج میرے لئے کانٹوں کا بستر بن گیا ہے ؎

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم فصل بہاراں بھول گئے

شریکِ حیات نے ڈبڈبائی آنکھوں سے عرض کیا۔ "میرے سرتاج! ایک دم سے فیصلہ کرتے وقت میرا اور اس نازک سی بچی کا جس نے ابھی شاہی محل میں صرف آنکھیں کھولی ہیں، خیال کر لیا ہوتا۔ ہماری شبستان محبت کا یہ مسکراتا ہوا پھول جسے پھولوں کا سیج اور لطیف آغوش ہی ملے ہیں اس کا کیا ہوگا؟"

"ارے نیک بخت! چرندوں، پرندوں، درندوں کو اور کیڑوں مکوڑوں تک کو رزق عطا فرمانے والا رب کیا ہمیں چھوڑ دے گا؟ دنیا میں پھیلے ہوئے کروڑوں مخلوق جس میں اس کے فرماں بردار، نافرمان اور باغی سب شامل ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ انھیں بھی اپنے فضل سے رزق عطا فرماتا ہے جو سرے سے ہی اس کے وجود کے منکر ہیں تو کیا ہمیں وہ اپنے فضل سے محروم رکھے گا۔ جبکہ ہم صرف اسی کے لیئے تخت و تاج چھوڑ رہے ہیں ؏

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

ویسے تمھیں اختیار ہے۔ اپنی اور بچی کے بہتر مستقبل کے لیئے شاہی محل میں رہ جاؤ یا آزمائش کی اس کڑی دھوپ میں میرا ساتھ دو۔ میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا کہ دنیا جہاں کی مشقتیں جھیلنے میں بھی تم میرا

ساتھ ضرور ضرور دو"۔ نہیں نہیں میرے سرتاج! جب میں بزمِ عیش و طرب میں اور مسرتیں سمیٹنے میں آپ کے ساتھ تھی تو دنیا کا دکھ جھیلنے کے لئے میں تنہا آپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ میں رفیقۂ حیات ہوں، رفیقۂ عیش ونشاط نہیں۔ میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہے جو آپ اپنے لیۓ پسند کریں، وہی میرے لیۓ بھی پسند فرمائیں۔ میرے لیۓ وہ جھونپڑا ہی شاہی محل ہوگا جہاں آپ ہوں گے سے

دیکھیں گی بھی اب کس کو تیرے بعد یہ آنکھیں
میں تجھ سے بچھڑ کر رہوں گی شہر میں تنہا

اطاعت شعار، فرماں بردار، پیکرِ وفا اور سعادت مند بیوی کے جواب نے حوصلوں کو بڑی توانائی بخشی، بالآخر سارے محل کو روتا بلکتا چھوڑ کر حکومت اپنے چھوٹے بھائی کو سپرد کر کے اپنی بیوی اور بچّی کو لے کر محل سے باہر نکل آئے اور اسی شہر کی مضافات کی بستی میں ایک معمولی سا مکان بنا کر رہنے لگے۔ ایک عام اور معمولی انسان کی طرح یادِ خدا اور خدمت خلق سے جو بھی وقت بچتا اسے رزقِ حلال کی سعی وحصول میں گزارتے۔ عبادت و ریاضت، صبر و قناعت، حزم و اتقاء اور شدید مجاہدۂ نفس بالخصوص فضلِ خداوندی کی بدولت آپ کا شمار خاصانِ خدا اور اس کے مقبول ترین بندوں میں ہونے لگا۔ لوگوں کی نگاہوں میں آپ کا احترام اور شدید تر ہوگیا۔ دوسرے طبقے کے مشائخین میں آپ کا شمار ہے۔ ابو بخش حدّاد، ابو تراب بخشی، ابوعبداللہ زراع بصری، ابوحفص نیشاپوری، ابوعبید بصری قدست اسرارہم وغیرہم کے معصر و ہم صحبت ہیں۔ حضرت ابوعثمان جبری کے پیرومرشد ہیں۔ مکمل چالیس سال تک طبیعت کے تقاضے

پر نہیں سوئے، آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو آپ اُن میں نمک بھر لیتے۔ چالیس سال کے بعد ایکبار سوئے تو خواب میں حق تعالےٰ شانہٗ کو دیکھا عرض کیا مولیٰ میں نے تجھے بیداری میں بہت تلاش کیا مگر تجھے خواب میں پایا۔ ندا آئی کہ یہ اسی بیداری کا معاوضہ ہے پھر تو آپ نے سونے کو اپنا معمول بنالیا کہ شاید پھر اسی بہانے جلوۂ بے نیاز کا نظارہ ہو جائے۔ آپ اپنے خواب پر اس قدر فرحاں و نازاں و شاداں تھے کہ فرمایا کرتے تھے:۔ اگر دونوں جہان اس خواب کے بدلے مجھے عطا کیا جائے تو بھی مجھے منظور نہیں۔ اس مقدس اور عظیم ترین خواب سے جب بیدار ہوئے تو یہ شعر آپکی زبان پر جاری تھا ؎

رَأَیْتُكَ فِی الْمَنَامِ سُرُوْرُ عَیْنِیْ
فَاَحْبَبْتُ التَّعَیُّشَ وَالْمَنَامَا

"اے میرے چشم مسرت کے سرمائے میں نے تجھے خواب میں دیکھا اسی لئے اب سونے اور آرام کرنے کو دوست رکھتا ہوں" پھر جب دیکھو آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ سو رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے مقصد صرف مشاہدۂ حق تعالےٰ شانہٗ ہوتا ہے۔ گویا مجنوں کے اس شعر کے مطابق ؎

وَاِنِّیْ لَاَ ستغشی وَمَا لِیْ غَشْیَۃٌ
لَعَلَّ خَیَالًا مِنْكَ یَلْقٰی خَیَالَكَ

"میں خود کو بے خودی (یعنی سونے) کی حالت میں رکھتا ہوں۔ حالانکہ سوتا نہیں۔ صرف اس امید پر آنکھیں بند ہوتی ہیں کہ تمہارا سراپائے ناز ہی میرے تصوّر کو آباد کرے" ؎

اُن کی آمد کا تصوّر رُوح پرور ہے مگر
دیکھئے کب ٹوٹتا ہے یہ طلسمِ انتظار

یحییٰ معاذ رازی کی کتاب غنا کی فضیلت کے رَد میں آپ نے فقر کی فضیلت لکھی اور بدلائل احسن ثابت کیا کہ فقر غنا سے افضل ہے آپ کی تصانیف میں "مرأة الحکماء" کافی مشہور ہے۔ حضرت ابو حفص نیشاپوری سے قیمتی قبا میں ملبوس کوئی سوال پوچھا آپ نے فرمایا خدا کی قسم تو شاہ ہے! شاہ شجاع نے عرض کیا جی ہاں میں شاہ ہوں کیونکہ ایسا سوال میں ہی کر سکتا تھا۔ فرمایا تم شاہ ہو اور قیمتی قبا میں؟ شاہ نے جواب دیا وَجَدْنَا فِی الْقَبَاءِ مَا طَلَبْنَا فِی الْعَبَاءِ جسے گدڑی میں تلاش کیا اُسے قبا میں پایا۔ ایک دن شاہ شجاع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سائل نے دو سیر روٹی کا سوال کر دیا۔ آپ کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے مگر کسی نے سائل کا سوال پورا نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کون ہے جو دو سیر روٹی کے بدلے میرے پچاس حج خرید لے؟ مجلس میں ایک عالم دین بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوئی انھوں نے کہا شیخ محترم: حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس کی یہ بے توقیری، استخفاف شریعت ہے۔ دو سیر روٹی میں پچاس حج! ہرگز نہیں! جب مجھے خود ہی اپنی قیمت نہیں معلوم تو میرے عمل و کردار کی قیمت کیا ہوگی؟

حضرت یحییٰ بن معاذ ایک زبردست خطیب اور وعظ گو تھے۔ آپ کے وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ چنانچہ نیشاپور میں آپ نے بڑا پر تاثیر وعظ کہا۔ جس میں سات آدمی جاں بحق ہو گئے۔ "ہری" ایک مقام کا نام ہے۔ حاکم ہری کی لڑکی کی فرمائش پر آپ نے چار دن وہاں پر وعظ کہا۔ آپ کے

وعظ کا ایسا اثر ہوا کہ چار دن میں ۴۵ آدمی آپ کی مجلس وعظ میں جاں بحق ہو گئے یہی یحییٰ بن معاذ حضرت شاہ شجاع کے گہرے دوستوں میں تھے۔ اتفاق سے کسی شہر میں دونوں جمع ہو گئے۔ حضرت یحییٰ نے آپ کو اپنی مجلس وعظ میں شرکت کی دعوت دی لیکن آپ تشریف نہیں لے گئے ان کے تالیف قلب کے لئے ایکبار ان کی مجلس وعظ میں تشریف لے گئے۔ ان کی لاعلمی میں چھپ کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اس وقت حضرت یحییٰ وعظ گوئی میں مشغول تھے کہ اچانک زبان بند ہو گئی۔ کوشش بسیار کے بعد بھی جب زبان نہیں کھلی تو فرمایا کہ شاید اس مجلس میں مجھ سے بہتر کوئی واعظ موجود ہے کہ جس کے تصرّف نے میری زبان بند کر دی ہے۔ یہ سن کر آپ سامنے آئے اور فرمایا کہ میں اسی وجہ سے آپ کی مجلس وعظ میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اہل فضل و ولایت کا فضل و ولایت اسی وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے کو صاحب فضل و ولایت تصور نہیں کرتے۔ فرمایا کہ فقر ایک سرِّ الٰہی ہے۔ فقراء جب تک اُسے پوشیدہ رکھتے ہیں امین ہوتے ہیں اور جب افشائے راز کر دیتے ہیں تو ان سے فقر چھین لیا جاتا ہے۔ فرمایا صدق کی تین علامتیں ہیں۔ اوّل دُنیا سے نفرت۔ دوّم مخلوق سے دوری، سوم خواہشاتِ نفس پر غلبہ۔ فرمایا صبر کی تین علامتیں ہیں۔ ترک شکایت، صدق رضا، اور قبولیت رضا۔ فرمایا میری مثال اس زندہ مُرغ سی ہے جس کو سیخ پر لگا کر آگ پر رکھ دیا جائے اور چاروں طرف سے آگ لگا دی جائے ؎

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

زندگی حسبِ معمول رَواں دَواں تھی۔ مہ و نجوم کی گردش بھی اپنی جگہ جاری وساری تھی کہ ایک دن مضافات کی اسی بستی میں کہ جس میں آپ کا گھر تھا ہٹو بچو کے شور کے ساتھ شاہی سواری بڑے کرّو فر اور شاہانہ طمطراق کے ساتھ آپ کے معمولی مکان پر اتری۔ سلطان نے بڑھ کر دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ گیا۔ شاہی سواری دیکھ کر آپ کو بڑی وحشت ہوئی مگر بادشاہ کی سعادت سے آپ کو خوشی ہوئی دورانِ گفتگو بادشاہ نے ادب اور قرینے کے ساتھ عرض کیا تایا حضور ایک طویل عرصہ ہوا ہم لوگوں سے آپ کو جدا ہوئے مگر کبھی آپ نے ملاقات کے لئے بھی قدم رنجہ نہ فرمایا۔ آخر ہم آپ کے حقیقی عزیزوں میں سے ہیں ہمارا خون بھی ایک ہی ہے۔ اس پر بھی نہ تو آپ نے خود پلٹ کر خبر لیا اور نہ ہی اپنے احوال کی خبر ہونے دی۔ ابا حضور نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وراثت میں یہ حکومت مجھے ملی ہے لیکن مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس پر اصل حق آپ ہی کا ہے۔ آپ جب چاہیں واپس تشریف لائیں۔ مجھے انشاء المولےٰ تعالےٰ آپ ایک سعادت مند بیٹا پائیں گے ؎

کیسے کروں میں بتا ترکِ تعلق کا یقیں
تیری یادوں سے ابھی بوئے وفا آتی ہے

آپ نے جواباً فرمایا بیٹا! جس حکومت کو میں نے ایک بار لات مار دی اس کے متعلق اب سوچنا ہی فضول ہے۔ اس عذابِ مسلسل کو بہت کچھ سوچ کر میں نے چھوڑا تھا اور میں اپنے اس فیصلے پر آج بھی خوش ہوں۔ لہٰذا اب اس کا ذکر ہی بے کار ہے۔ یہ تخت و تاج اور شوکتِ اقتدار تمھیں مبارک ہو۔ دورانِ گفتگو بادشاہ کی نظر ایک سرو قد لالہ رخسار

حسن فروزاں پر پڑی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی وہی چچازاد بہن ہے جو شاہی محل میں پیدا ہوئی تھی جو نہ صرف یہ کہ شہزادی تھی بلکہ حسن و دلکشی اور جمال و زیبائی کی بھی شہزادی تھی جو سیرت و اطوار، اخلاق و عادات، عبادات و ریاضات اور توکل و استغناء میں اپنے باپ کا عکس جمیل تھی ؎

مصحفِ رُخ کسی کا ہے کہ بیاضِ حافظ
اپنے چہرے سے تو بس فال نکالی جائے

بادشاہ کو وہ شہزادی بہت پسند آئی۔ اس کے حیران کن حسن سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اس کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا۔ بڑی شائستگی اور لجاجت کے ساتھ کہنے لگا۔ چچا حضور! آپ تو اس مشقت پسند زندگی کے عادی ہو گئے ہیں تو اپنے ساتھ انھیں کیوں مشقت پسندی میں گھسیٹے ہوئے ہیں۔ اگر آج آپ خود تشریف نہیں لے چل رہے ہیں تو کم از کم چچی حضور اور شہزادی عالیہ ہی کو شاہی محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں جہاں پر ہر طرح کی آسائشیں اُن کی منتظر ہیں۔

کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے! جس بات کو میں نے اپنے لئے پسند نہیں کیا اسے اپنے اہل و عیال کے لئے میں کیوں کر پسند کروں گا؟ اور ہمارے بیوی بچے اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔

تایا حضور! ہم نے محض اُن کے آرام کے خیال سے عرض کیا تھا کوئی دل شکنی مقصود خواطر نہیں تھی۔

بیٹا! جس بات کو ہم بھول گئے اس کا تذکرہ ہی عبث ہے۔

بادشاہ بڑا مضطرب تھا۔ ہر دم وہ سرو قد، سیمیں تن، نازک بدن، غنچہ دہن، آہو چشم، لالہ رُخ، خوبصورت ترین پر تقدس سراپا

نگاہوں میں گھومتا رہا ؎

ہر وقت ایک حسین تصوّر میں گم ہوں
جلوے کسی کے کیا میری آنکھوں میں بس گئے

حُسن کی قوّتِ تسخیر تو ایک مسلمہ امر ہے اور جب اس میں معنوی تقدّس کی آمیزش ہو جائے تو وہ بڑا محترم اور پاکیزہ پاکیزہ سا ہو جاتا ہے۔ نوجوان بادشاہ کی جوان دھڑکنیں اس سَراپائے ناز کے تصوّر سے مربُوط ہو کر رہ گئیں اب دن رات اس فروزاں حسن کے جلوے اپنے گرد و پیش بکھرے محسوس ہوتے ؎

اب تو ہر سمت کھلے ہیں تیری یادوں کے گلاب
دِل کے ویرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے

گوہر مقصود کے حصول کے لئے اپنے دلِ بیتاب کے ہاتھوں مجبُور ہو کر بادشاہ نے اپنی والدہ کے ذریعے شاہ شجاع کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا شاہ شجاع نے بادشاہ کے اس پیغام کو خوبصُورتی کے ساتھ ٹالنے کی بڑی کوشش کی مگر عورت ذات اور وہ بھی حقیقی بھائی کی بیوہ کے سامنے ایک نہ چل سکی۔ سُلطان کی والدہ کے شدید اصرار پر آپ نے اس نازک مسئلے میں غور و فکر کے لئے تین دن کی مہلت مانگی۔ بادشاہ کی ماں نے کہا بھائی جان آپ چاہے جتنے دن کی مہلت لیں مگر میں جواب میں ہاں ہی سُننا چاہتی ہوں۔ میں ہر قیمت پر اپنی بیٹی کو شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ یہ بہت دن آپ کے ساتھ مشقت جھیل چکی۔ اپنی فطری و پیدائشی حق کیسا تھ ہی ساتھ اپنی گوناگوں خوبیوں، بے پناہ حسن و جمال اور نسوانی وقار و تمکنت کی بدولت اب شاہی محل ہی اس کا صحیح مقام ہے۔ سُلطان کی والدہ

کے جانے کے بعد آپ کو بڑی فکر دامنگیر ہوئی کہ وہ اپنی عابدہ، زاھدہ، صابرہ اور انتہائی نیک و سعادت مند بیٹی کے لیے کیا کریں۔ جو چیز انھیں خود پسند نہیں تھی وہ اپنی اولاد کے لیئے کیونکر پسند ہو سکتی تھی۔ جس بستی میں آپ کا قیام تھا وہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی آپ نے بنا رکھی تھی جس میں آس پاس کے لوگ آکر نماز پڑھتے تھے۔ انھیں میں ایک غریب خدامست پرہیزگار نوجوان بھی تھا اپنے اخلاق و عادات اور حسنِ عمل کی بنا، پر وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ نماز میں خشوع وخضوع اور طویل سجدوں کی وجہ سے وہ آپ کی نگاہوں میں محترم تھا۔ کافی غوروفکر کے بعد دل میں ایک حتمی فیصلہ کرکے اٹھے۔ سب سے پہلے مسجد میں گئے۔ حسنِ اتفاق وہی نوجوان جو تھوڑی دیر پہلے آپ کا مرکزِ تصور تھا۔ معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز نظر آیا۔ آپ جاکر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد اس نے نماز ختم کی۔ اس نے بڑھ کر سلام کیا۔ سلام ودعا کے بعد خیریت دریافت کی اور گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اثنائے گفتگو آپ نے اس سے دریافت فرمایا" صاحبزادے! کیا تم شادی شدہ ہو؟" نوجوان نے ادب کیسا تھ جواب دیا۔" نہیں"۔

"شادی کرنا پسند کروگے؟"

"میں ایک مفلوک الحال اور بے حد غریب آدمی ہوں۔ ایسے کنگال آدمی کو کون اپنی بیٹی دینا پسند کرے گا؟"

نوجوان! اگر پسند کرو تو میں اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار ہوں"

تحیر خیز مسرت کے عالم میں لرزتے ہوئے نوجوان نے عرض کیا: حضور والا! یہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ کہاں آپ اور کہاں میں؟ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ آپ ہی اس ملک کے حقیقی فرماں روا ہیں۔ اور آج بھی شاہی

سواری آپ کے دولت کدے پر آئے دن اترتی رہتی ہے۔ آخر ایک شہزادی اور ایک بے نوا فقیر کا کیا جوڑا؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک؟ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند؟ بھلا یہ شادی بھی کہیں کامیاب ہو سکتی ہے؟ اور پھر ایک شہزادی کب ایک کنگال کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر سکتی ہے۔

نوجوان! جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ مگر وہ میری بیٹی ہے۔ اس کی سعادت سے مجھے امید ہے کہ وہ میرا فیصلہ بڑی خوشی کے ساتھ قبول کرے گی۔ پھر اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں کوئی قدم آگے بڑھاؤں۔ شریعت کی رو سے آخری فیصلہ تو اسے ہی کرنا ہے؟

آپ کی غلامی میرے لیئے بڑی سعادت ہو گی۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے غربت کدے کا ماحول شہزادی کا طبع نازک برداشت نہ کر سکا تو جگ ہنسائی جو ہو گی سو ہو گی ہی میرا فقر و فاقہ الگ رسوا ہو گا اور سرِ راہ میری غربت نشانِ تضحیک بنے گی ؎

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
کوئی شجر میرے رستے میں سایہ دار نہ تھا

نوجوان! تو بیجا اندیشے سے اپنے آپ کو ہلکان مت کر۔ ایک بار جب میں نے کہہ دیا کہ وہ میری بیٹی ہے اور اسے تجھ سے زیادہ میں جانتا ہوں تو خاطر جمع رکھ اور اپنے رب پر بھروسہ رکھ وہ جو بھی کرے گا بہتر ہی ہو گا یہ بتا کہ تیرے پاس کچھ رقم ہے؟"

"جی ہاں! صرف تین درہم"

"کافی ہے۔ ایک درہم کی روٹی، ایک درہم کا سالن، اور ایک درہم کا خوشبو خرید لینا" مسجد سے واپس آکر آپ نے اپنی بیوی سے

اس نوجوان کا ذکر کیا اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ اس تین دن کے اندر اندر اپنی بیٹی کا نکاح اس نوجوان سے کر کے رخصت کر دوں۔ میں بادشاہ کا رشتہ کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔ جس بادشاہت کو میں نے لات مار دی اس کو اپنی اولاد کے لئے کیونکر پسند کر سکتا ہوں۔ تمہاری اس بابت کیا رائے ہے؟

پیکرِ وفا اور نیک بخت بیوی نے جواب دیا "بیٹی کے حق میں آپ جو فیصلہ کریں گے وہ ہر حال میں بہتر و صائب ہو گا۔ مگر ایک زبان بیٹی سے بھی دریافت فرمالیں اور ایسی صورت میں یہ اجازت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جبکہ اس کے کان میں شاہی رشتے کی بھنک پڑ چکی ہے"

ہاں ہاں! اس سے پوچھنا تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اسلام نے بالغ لڑکی کو اتنا اختیار تو دیا ہی ہے کہ والدین یا اولیاء اگر زبردستی اس پر اپنا فیصلہ دل پسند مسلط کرنا چاہیں تو اسے وہ مسترد کر سکتی ہے اس نازک اور اہم ترین مسئلے میں میں خود دو ٹوک اس سے بات کرنا پسند کروں گا۔ جاؤ تم کسی بہانے اسے میرے پاس بھیجدو۔

"ابا حضور! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

"ہاں بیٹی! بیٹھ جاؤ۔ ایک نازک مسئلے میں تمہارا مشورہ بہت ضروری ہو گیا ہے میں نے براہِ راست تم سے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ بیٹی! بات دراصل یہ ہے کہ بحمدہٖ تعالےٰ تم اب عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکی ہو جہاں پہونچ کر والدین کو اپنی بچی کے لئے بہتر مستقبل کی فکر ہونے لگتی ہے اور والدین کو نکاح کے پیغام ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں تمہاری طرف سے غافل نہیں تھا بلکہ اپنے حسبِ حال کسی مناسب رشتے کا منتظر تھا کہ بے شان و گمان بادشاہ کی والدہ تمہارے لئے سلطان کا پیغام لے کر آگئیں جس کا

کسی حد تک تم کو بھی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے کے حق میں نہیں۔ میں نے خوبصورتی کے ساتھ اس رشتے سے بچنے کی بڑی کوششیں کیں لیکن سلطان کی والدہ نے اپنی قرابت داری اور خون کی دہائیاں کچھ اس انداز سے دینے لگیں کہ صاف لفظوں میں انکار کرتے نہیں بنا۔ اور وہ پھر اپنی بات کے علاوہ دوسرے کی کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ ہر حال میں تمھیں اپنی بہو کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے غور و فکر کے لیے تین دن کا وقت لیا ہے کہ ان تین دنوں میں سوچ کر جواب دوں گا۔ انھوں نے چلتے چلتے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ آپ چاہے جتنے دن کا موقع لیں فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے۔ میں اپنی بیٹی یعنی تمھیں ہر حال میں شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ بیٹی! شاہی محل اور بادشاہی ایک خواب ہے عوام کے لئے۔ لیکن کوئی مجھ سے پوچھے میں اسے جھیل چکا ہوں وہ روح کے لیے ایک مستقل آزار ہے۔ میں ایک صالح متقی اور متوکل مگر بہت غریب نوجوان کو جانتا ہوں۔ وہ نوجوان تقویٰ اور پرہیزگاری اور عبادت گزاری کے باعث مجھے پسند ہے۔ تم بادشاہ اور اس غریب مگر پرہیزگار نوجوان میں سے جسے پسند کرو اسے اپنے فیصلے سے مجھے جلد آگاہ کرو۔ انھیں تین دنوں میں مجھے تمھارے متعلق کوئی بڑا اور حتمی فیصلہ کر ڈالنا ہے۔"

شہزادی اپنی شادی کے ذکر پر شرم و ندامت سے سرخ ہو گئی

لڑکی کی شرم ہی تو اس کا اصل حسن ہے ؎

کتنے رنگین تصور کی حنا بندی ہے
بوئے گل، لالۂ دل، دونوں چمن سے گذرے

شہزادی بڑے قرینے سے اٹک اٹک اور جھجھک جھجھک کر کہنے لگی ابا حضور!

جو آپ کو پسند نہیں تو کیا آپ کو یہ امید ہے کہ آپ کی بیٹی اسے پسند کرے گی۔ جو چیز آپ کی روح کا آزار ہے وہ رُوح کی بہاروں کا موسم کیسے بن سکتا ہے؟ آپ کی پسند ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔" ؎

اہلِ وفا کے باغ سے پھوٹی نہیں اگر
خوشبو کہاں سے آئی یہ شاخِ گلاب میں

سُبحان اللہ! جزاک اللہ! تمہاری سعادتمندی سے مجھے یہی امید تھی کہ خدائے پاک و بے نیاز تمہیں دارین کی خوشیاں میسر فرمائے۔" شہزادی خاموشی سے اٹھ کر باپ کے پاس سے چلی گئی۔

دوسرے دن محلّہ کے معززین کے سامنے شاہ شجاع نے اپنی خوبرو اور سعادت مند بیٹی کا نکاح اس غریب نوجوان سے کر دیا۔ نکاح کے بعد بیٹی کو دولھا کے ساتھ اسی رات رخصت بھی کر دیا۔ خاموش مسرّتوں کے ہجوم میں شہزادی نے حجلۂ عروسی میں قدم رکھا۔ آرزوئے شوق کی گھما گھمی میں اپنے تنگ دامن میں دونوں جہان کی خوشیاں سمیٹے دُنیا کا خوش نصیب ترین دولھا بھی ساتھ میں تھا۔ دولہن شہزادی نے ایک شانِ استغناء سے اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ کمرے کی حالت دُولھا کے غربت و بے سروسامانی کی تصویر تھی۔ اس فلاکت زدہ کمرے میں جوں جوں شہزادی کی نظر ادھر سے ادھر ہوتی۔ غریب دُولھا کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جاتی تھیں اور چہرے پر اپنی کم مائیگی اور بے سروسامانی کا احساس نمایاں ہو جاتا۔ اپنی حیثیت اور شہزادی کی عظمت پر ہراساں اور اس کے حسن فروزاں سے مبہوت صورتِ حال کی نزاکت نے اس کے دل کی دُنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ؎

اب تو آنکھوں کی سیج پر ہمدم
سارے منظر ترے وصال کے ہیں

بالآخر شہزادی کے نظروں کی گردش کمرے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے پانی کے ایک برتن پر ٹھہر گئی۔ ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ جنبش لب نغمہ بار ہوا۔

"وہ کیا ہے؟"

"پانی کا گھڑا جس کے اندر پانی بھرا ہوا ہے۔"

"گھڑے پر کیا ہے؟"

"ایک روٹی کا آدھا ٹکڑا۔ نصف کھالیا ہوں اور نصف کل کے لئے بچا لیا ہوں۔ یہی میری کل پونجی ہے۔"

یہ سن کر شہزادی کے بے حد حسین چہرے پر گرد ملال ظاہر ہوا۔ طبع نازک کبیدہ خاطر ہوا۔ چمن کی ہر کلی کو شرمانے والا جاں نواز تبسم شرربار رہوا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ دولہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مجھے ابھی میرے باوجی خان کے گھر واپس پہونچا دیجئے۔" یہ آواز کیا تھی۔ اس کے آرزوؤں کے حسین محل میں ایک دھماکہ تھا۔ تمناؤں کی بارات تو ابھی سج ہی رہی تھی۔ اُمنگیں ولولے شادکام حسرتوں میں تبدیل ہونا ہی چاہتے تھے کہ اچانک یہ کیا ہوگیا؟

نوجوان خواص باختگی کے عالم میں بڑے درد کے ساتھ لرزتی آواز میں عرض کناں ہوا "قابل احترام شہزادی یہ کیا سن رہا ہوں؟ یہ بیداری ہے یا خواب؟" "آپ جو کچھ سن رہے ہیں بیداری کے عالم ہی میں ہیں اور صحیح سن رہے ہیں ایک بار پھر سن لیجئے کہ مجھے اپنے باپ کے گھر

ابھی واپس پہونچا دیجئے۔ میں ہر حال میں آج ہی اپنے والد گرامی تک پہنچنا چاہتی ہوں"۔

نوجوان درویش نے بڑے کرب کے ساتھ کہا "شہزادی عالیہ! اتنی بڑی اور کڑی سزا ہمیں کس جرم کی پاداش میں دے رہی ہیں آپ؟

خدا شاہد ہے کہ میں نے آپ کے یا آپ کے والد کے ساتھ کوئی دھوکہ کوئی فراڈ نہیں کیا۔ ان پر اپنی غربت و بے سروسامانی نہیں چھپائی۔ حد یہ ہے کہ میں خود سے آپ کے تصور کا مجرم بھی نہیں۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے بار بار میں نے اپنی غربت و افلاس کا حوالہ دیا۔ اس بے جوڑ شادی کے انجام کو بھی ان کے سامنے رکھا کہ کہاں میری فلاکت زدگی اور کہاں ایک بے مثال شہزادی؟ میرے غربت کدے کا ماحول شہزادی کا طبع نازک نہیں برداشت کر سکے گا مگر وہ نہیں مانے۔ آپ کی سعادت مندی اور استغناء کا خطبہ پڑھتے رہے کہ وہ ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے والی لڑکی ہے۔ تم مطلق اندیشہ نہ کرو۔ انھیں مسلسل یقین دہانیوں پر میں نے اتنی بڑی حماقت کی جرأت کی تھی۔ کاش! مجھ سے اتنی بڑی غلطی سرزد نہ ہوتی۔ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کا یہی حشر ہوتا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اپنے والد ماجد کے کئے ہوئے کی سزا اس غریب و ناتواں کو نہ دیں۔ آج ہی میری شادی ہوئی ہے۔ آج ہی آپ نے دولہن بن کر میرے غربت کدے میں قدم رنجہ فرما کر مجھے ایک آفاقی خوشبو سے آشنا کیا ہے۔ یہ ہماری لیلۃ الزفاف (سہاگ رات) ہے ؎

یہ قرب کے لمحات اگر بھول بھی جاؤں
برسوں مجھے تڑپائے گی احساس کی خوشبو

اگر آج ہی آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو یہ شادی زندگی بھر کے لیئے ایک سزا بن جائے گی۔ سرِ راہ میری محرومیوں کا مذاق اڑایا جائے گا۔ میرا فقر و فاقہ رسوا ہوگا۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ میری عرضداشت پر غور فرمائیں مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ آپ حسنِ صورت و سیرت دونوں میں منفرد اور عام سطح سے بالاتر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شاہی رشتے کو مسترد فرما دیا ہے۔ میں اپنے نصیبے کی ارجمندی پر فرحاں اور اپنی فیروز بختی پر نازاں تھا کہ مجھ بے نوا کو ایک بادشاہ پر ترجیح دیا گیا۔ آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ تصورات کے یہ حسین محل آنِ واحد میں زمین بوس ہو جائیں گے۔ جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا تھا وہ سراب محض ہوگا۔ ہائے کس درد کے صحرا میں تنہا بھٹکنے کے لیئے مجھے چھوڑ رہی ہیں آپ سے

یاس کی نیند سلانا اگر تھا ہی منظور
میری امید کی راتوں کو جگایا کیوں تھا

"میرے سرتاج! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کو ہمیشہ کے لیئے چھوڑ کر نہیں جا رہی ہوں۔ میرا مستقبل آپ کے ساتھ تو میری ہی مرضی سے وابستہ ہوا ہے۔ میرا مرنا جینا اب آپ ہی کے ساتھ ہوگا۔ میں سر دست اپنے عظیم باپ سے یہ پوچھنے جا رہی ہوں کہ آپ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ تمہارا نکاح ایک متقی پرہیزگار اور متوکل مگر غریب و نادار نوجوان سے کرنا چاہتا ہوں اسی بنیاد پر میں نے بادشاہ کے پیغام کو مسترد کر دیا تھا۔ والدِ گرامی سے یہ پوچھنا ہے کہ رشتے کی منظوری لیتے وقت آپ نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔ آپ کو بادشاہ کے بجائے یہی نوجوان پسند تھا تو آپ ہمیں صرف حکم دیتے۔ تقویٰ اور توکل کا فریب کیوں دیا؟ جس شخص کو

رزاق مطلق پر اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ جس نے اپنے فضل سے رزق عطا فرمایا ہے وہی کل بھی دے گا جو آدھی روٹی آج کھاتا ہے اور آدھی کل کے لئے بچا رکھتا ہے کہ پتہ نہیں کل روزی ملتی بھی ہے کہ نہیں؟ وہ صاحب تقویٰ و توکل کیوں؟ جسے اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ وہ رزاق کل بھی روزی دے گا اسکے متعلق یہ کیسے یقین کرلیا گیا کہ وہ پرہیزگار متوکل اور خدا رسیدہ ہے؟ افسوس تو اس بات پر کہ جسکی وجہ سے شاہی رشتہ ٹھکرایا وہ یہاں سرے سے ناپید ہے۔ میں اپنے باپ کے دامن کو پکڑ کر جھنجھوڑوں گی کہ آپ نے مجھے ایک ایسے شخص سے کیوں بیاہ دیا جسکے پاس توکل استغناء اور پرہیزگاری نام کی کوئی چیز نہیں۔

شہزادی کے جواب سے نوجوان درویش سناٹے میں آگیا۔ شرم و ندامت سے ڈوبی آواز میں عجز و درماندگی کیساتھ عرض گزار ہوا: عظیم باپ کی عظیم بیٹی آپ کے متعلق میں اوچھے انداز فکر پر بہت نادم اور ساتھ ہی معافی کا خواستگار ہوں۔ تقویٰ و پرہیزگاری۔ توکل و استغناء کے جس مفہوم سے آپ نے مجھے آشنا کیا ہے بیشک یہ شاہ شجاع کی شہزادی ہی کا حصہ ہے اور ان کی تربیت خواص کا طرۂ امتیاز! یہ روٹی اتنا بڑا فتنہ ثابت ہوگی مجھے نہیں معلوم تھا اور ایک طرح اچھا ہی ہوا کہ اسی کی بدولت تقویٰ و توکل کے ایک نئے بہترین روپ سے روشناس ہوا۔ یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خالی ہاتھ واپس آیا کہ میں نے اسے ایک فقیر کو خیرات کردیا ہے میں آپ کا بیحد ممنون کرم ہوں کہ آج آپ نے مجھے توکل کی اصل حقیقت سے آشنا کیا۔ شہزادی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک لطیف تبسم کے ساتھ نے سرے سے اپنے شوہر کی طرف محبت پاداش نظروں سے دیکھا ہے

تبسم اور پھر ان کے لبوں کا ✻ چمن کی ہر کلی شرما رہی ہے

متھرا کا پنڈت

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر متھرا مرلی والے کرشن جی کے مقام پیدائش ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کا مرکز عقیدت تھا۔ متھرا کی تاریخی حیثیت جو بھی رہی ہو مگر کرشن جی اور ان کی گوپیوں نے اپنی مذہبی حیثیت سے شہرت دینے میں نمایاں رول ادا کیا اور آج بھی ہندوؤں کی نظر میں اس کا افسانوی تقدس برقرار ہے۔

کرشن مراری کے اسی شہر میں ایک انسان ہفتوں سے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے متاع گم گشتہ کی تلاش ہے۔ لمبا کرتا، چہرے پر گھنی داڑھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے ہیں، اسکی متوحش اور متجسس نگاہیں صبح سے شام تک بلند مقامات اور ان کے در و بام پر پھسلتی رہتیں اور کبھی کبھی بے چینی کے عالم میں آہ سرد کے ساتھ پر درد آواز میں یہ پڑھتا نظر آتا ہے

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست\
در رہ کدام فتنہ گراست و زمان کیست

خوش نصیب! موسم بہار کی ایک صبح اپنے دامن میں مسرتوں کے خزانے سمیٹے طلوع ہوئی۔ چند زہرہ جبینوں کا ایک جتھا خرام ناز سے چلتا ہوا شہر سے چلتا ہوا شہر سے باہر نکلا۔

بڑے ناز، بڑے انداز، بڑے تمکنت کے ساتھ! دلربائی کا تمام تر بانکپن لئے ہوئے قدم قدم پر محشر بپا کئے ہوئے۔ لگتا ایسا تھا کہ گوپیاں اپنے روٹھے ہوئے کرشن کو منانے کے لئے ناز و ادا کے اسلحے سے مسلح ہو کر نکلی ہیں۔

الھڑ دوشیزاؤں کی اس گروہ میں "لاجونتی" کی حیثیت سب سے نمایاں تھی۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اسے حسن کی دولت سے نوازا تھا۔ سروقد، لمبی سیاہ زلفیں، ساون کی اٹھتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح، خوبصورت پتلے پتلے ہونٹ، شہابی چہرہ، مسکراتی آنکھیں، گھنے ابرو، جب کھکھلا کے ہنستی تو اسکے چہرے پر شفق کے رنگین لہرے پھوٹ پڑتے اور جب وہ ایک ادائے ناز سے اپنے آنچل درست کرتی تو حیات کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوتیں اور جانے کتنے بوڑھے جواں سسکیاں لینے لگتے۔ غرور حسن نے کنیاؤں کو اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آگے پیچھے دیکھ کر چلنا بھی انھوں نے اپنی بے نیازیوں کی توہین سمجھا۔ باہم اٹھکھیلیاں کرتیں، شاخ گل کی طرح لچکتی مچکتی سمٹتی چلی جا رہی تھیں کہ اچانک سر راہ متھرا کی گلیوں میں وہی ہفتوں بھٹکنے والا اجنبی مسافر آگیا اور بڑی حسرت و امید کے عالم میں "لاجونتی" کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا ؂

خوشا رسوائی و حالے تبا ہے
سرِ راہے و آہے یک نگاہے

معلوم نہیں اور لڑکیوں نے اس شعر کا مطلب سمجھا یا نہیں مگر "لاجونتی" تڑپ اٹھی۔ بھوکی شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی بولی! بڑے میاں تمھیں شرم آنی چاہئے کم از کم اپنے چہرے پر اس سفید داڑھی کا تو کچھ خیال کرو کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ یہ متھرا ہے متھرا۔ جھنجھلا

نہیں - چلو اپنا راستہ لو - اور پھر خبردار ! اپنا یہ منحوس تھوبڑا مت دکھانا - اس طرح گرجتی برستی وہ اپنے سہیلیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گئی - اس کی سکھیاں سہیلیاں حیران پریشان کبھی اس اجنبی کو دیکھتیں اور کبھی غیض وغضب میں بھری ہوئی خوبصورت لاجونتی کو جس کے چہرے پر غصے نے اور دلآویزی پیدا کر دی تھی -

بالآخر ایک نے چلتے چلتے ہمت کر کے پوچھ لیا : اے راجہ اندر کے سنگھاسن کی پری ! آخر اس غریب نے کیا کہہ دیا جو تم اس قدر آپے سے باہر ہو گئیں - اس نے تو صرف ایک کویتا پڑھا تھا اور وہ بھی اپنی زبان میں جو ہم لوگوں کے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا - ہاں اگر تم نے کچھ سمجھا ہو تو بتا دُ تاکہ پھر کبھی ملے تو اس کی ٹھکانے سے خبر لی جائے -

جیسے تم لوگوں نے کچھ نہیں سمجھا ایسے ہی میں نے بھی کچھ نہیں سمجھا لاجونتی نے بہت کچھ چھپاتے ہوئے جواب دیا -

پھر اسے دیکھتے اور اس کے منھ سے کویتا سنتے ہی کیوں آپے سے باہر ہو گئیں اور اس غریب پر اس طرح ٹوٹیں کہ وہ تھوڑی دیر میں جانے کتنی بار مر مر کے جیا - ویسے اگر تمھیں اپنی سُندرتا کی طاقت کو آزمانا ہی تھا تو صرف مسکرا کے اس کی خیریت ہی پوچھ لیتیں وہ یوں ہی قتل ہو جاتا -

گائتری جی! تم تو لگیں مذاق اڑانے - حالانکہ بھگوان نے تمھیں خود اتنی سُندرتا دی ہے کہ اگر بہادر سے بہادر جوان کی طرف ایک غلط نگاہ ڈال دو تو وہ اپنا دل پکڑ کر تڑپنے لگے اور چیخ چیخ کر تمھاری بے نیازی کا ماتم کرے کہ ؎

یوں ترچھی نگاہوں سے مجھے قتل بھی کرنا
پھر صاف مکر جانا کہ میں اس سے بری ہوں

سچ جانو سکھی جانے کیوں ان موئے ترکوں کو دیکھکر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

ارے واہ! یہ کوئی بات ہوئی؟ ہمارے اسی شہر میں نہ جانے کتنے ترک بستے ہیں اور وہ روزانہ بہتیرے آتے جاتے رہتے ہیں ان لوگوں کو دیکھکر تو ہم لوگوں کے تن بدن میں بالکل آگ نہیں لگتی۔ شاید میری رانی اتہاس (تاریخ) زیادہ پڑتی ہے اور اس کی آنکھوں میں ہر ترک کے چہرے پر غزنی کے اس ملیچھ انسان کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس نے متھرا کو لوٹتے وقت اس کی پوترتا کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔

لو تم متھرا کو رو رہی ہو۔ وہ تو تھانیسر اور سومناتھ جیسی شکتی والی تیرتھ گاہوں کو بیدردی کے ساتھ روندتے ہوئے ہمارے بڑے بڑے دیوتاؤں کے قہر سے نہیں ڈرا۔ اپنے سترہ حملوں میں سارے ہندوستان کو اکھاڑ پچھاڑ کر رکھ دیا۔ مگر یہاں کے سیکڑوں راجہ اپنی بھاری سینا کے باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے اور وہ آنلا دسانڈ کی طرح اکھنڈ بھارت میں دندناتا رہا۔ آج اپنی اتہاس پڑھتے وقت اپنے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں اور سینا پتیوں کی کاپرتا پر ہمیں بیحد شرم آتی ہے۔ اس طرح وہ باہم الجھتی ہوئیں اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئیں۔

ایک دن صبح ہی صبح روپ وتی "لاجونتی" کے ماسی کے گھر پہونچ گئی۔ ماسی کو نمستے کرنے کے بعد وہ سیدھے لاجونتی کے کمرے میں پہونچی۔

ارے دیوی جی! ابھی آپ کا سونا ہی ختم نہیں ہوا؟

آؤ روپ آؤ۔ ابھی ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ بہت دن تک جیوگی۔

ہاں آج بہت دیر تک جاگتی رہی اسی لئے سویرے اٹھ نہ سکی۔

دھنیا باد! میں یاد تو آئی۔
یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں نے سچے دل سے تمھیں یاد کیا اور تم کھنچی ہوئی چلی آئیں ؎

ہم نے ان کو تو پکارا ہے مگر اے جذبۂ دل
ان پر بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لیکن یہ تم نے مانجھے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرح ایک دم سے باہر نکلنا کیوں چھوڑ دیا؟
ہاں آج کل میں باہر کم ہی نکلا کرتی ہوں۔
کیوں؟ کیا اسی کوبیتا پڑھنے والے ترک کے ڈر سے۔ ارے وہ تو بڑا کاپر نکلا۔ تمھارے ایک ہی جھاڑ سے وہ متھرا سے ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! لیکن میں یہ نہیں مان سکتی کہ اس دن کے کوبیتا کا مطلب تم نہیں جانتی ہو۔ عورتوں کی چھٹی حس اگر کوئی چیز ہے تو میں یہ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس دن کے کوبیتا اور تمھارے درمیان ضرور کوئی بھید ہے۔ اسے دیکھتے ہی تمھارا ٹمپریچر چڑھ جانا اور تمھیں دیکھ کر اس کے آنکھوں کی مخصوص چمک اور پھر غصے میں تمھارا یہ کہنا کہ یہ متھرا ہے متھرا۔ جھنجھان نہیں۔ اپنے پیچھے کوئی کہانی لئے ہوئے ہے۔ لاجو! میری جان کیا تم اس کوبیتا کے پیچھے چھپے ہوئے بھید سے پردہ اٹھا سکتی ہو؟ میں اسی دن تم سے پوچھ بیٹھتی مگر سہیلیوں کے ہجوم میں اسے مناسب نہیں سمجھا۔ آج اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر ڈالو۔ عورتوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں مگر تم اپنی روپا کو اس کا الٹا پاؤ گی۔ اچھا بس شروع ہو جاؤ۔
روپ! تم جانتی ہو کہ میں نے آج تک تم سے کوئی بات نہیں چھپائی اور

چھپا بھی نہیں سکتی۔ تم متھرا میں میری سب سے پیاری سہیلی اور میری ہمراز ہو۔ میں کئی دن سے خود تم سے ملنے کے لیے سوچ رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آگئیں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن روپ! تم یہ بات اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ یہ بات صرف ماسی کو معلوم ہے کہ میں یہاں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں پڑی ہوں تمھیں کرشن بھگوان اور ان کی گوپیوں کی اٹوٹ محبّت کی قسم جو یہ بات تم سے آگے بڑھے۔

ارے پگلی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟

اچھا تو سنو! اس دن اس ترک کے کویتا اور اس کے پڑھنے کے مقصد کو میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اسی لئے میں اس پر بُری طرح بھڑک اٹھی تھی۔ اچھا تمھیں بتاؤ کہ اس میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے۔ میں ایک ہندو کنیا اور کہاں وہ مسلمان؟ بیسؔ سال کی میں کنواری اور کہاں چالیسؔ کے اوپر کا وہ مسنڈا! کسی طرح کی کوئی بھی تو نسبت نہیں۔ اور بڑے میاں چلے ہیں مجھ جیسی ہندو لڑکی پر عاشق ہونے۔

کیا کہا؟ وہ موا ترک تم پر عاشق ہے؟

ہاں روپ! اور عاشق بھی ایسا ویسا نہیں مجنون، فرہاد، رانجھا، ان سب کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا۔ مگر ہمارے بڑے میاں کی شان سب سے نرالی ہے۔ بڑے میاں مسلمانوں کے معزز پیشوا تھے سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو ان سے گیان دھیان ملا۔ یہ خود بھی بال بچّے دار آدمی ہیں۔ عربی فارسی اردو کے بہت بڑے جانکار ہیں۔ سیکڑوں لوگ اُن کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ ایک بار کہیں انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ بس اسی دن سے دیوانے ہو گئے۔ مسجد مدرسہ گیان دھیان پرار تھنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ

بس میرے پیچھے پڑ گئے یہاں تک کہ میرا گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے رات دن میری گلی کے چکر لگاتے رہتے۔ اور اکثر دھرنا دیئے پڑے رہتے۔ دُنیا کی تھوک فضیحت، لعنت ملامت کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ آزاد اور کھلنڈرے لوگوں کے لئے بڑے میاں اور میری ذات ایک دلچسپ کھلونا بن کر رہ گئی۔ مجھے بدنامی سے بچانے کے لیے میرے گھر والوں نے کرشن بھگوان کے اس پوتر شہر متھرا میں مجھے اپنی ماسی کے یہاں سارا کچا چٹھا بتا کر بھیج دیا۔

میرے یہاں آجانے پر میرے گھر والوں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اور میں بھی خوش ہو گئی کہ چلو میری عزت بچ گئی۔ رُسوائی جگ ہنسائی سے بھگوان نے بچا لیا۔ مگر میرے خوشی کے یہ دن بہت تھوڑے ثابت ہوئے بڑے میاں یہاں بھی آدھمکے اور اسی دن سے میرا سکون غارت ہو گیا۔ اب رات بھر مجھے نیند نہیں آتی۔ ماسی کو بھی اس دن کے بھاؤنا کی خبر نہیں دی۔ اب تم ہی کوئی اُپائے بتاؤ نہیں تو متھرا میں بھی میرا رہنا کٹھن ہو جائے گا۔

رام رام! یہ تو کوئی نہانی معلوم ہوتی ہے۔ سچ مچ تم بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہو بھگوان تم کو اس مصیبت سے بچائے اچھا کیا جو ماسی سے یہ بات نہیں بتائی ورنہ وہ تو اور بیاکل ہو جاتیں۔ تم کوئی چنتا نہ کرو یہ متھرا ہے اگر بڑے میاں سیدھی طرح راہ پر آ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے لئے ضرور کوئی اُپائے کیا جائے گا۔ میں ہر طرح سے تمھارے ساتھ ہوں۔ ویسے میں برابر نکلتی ہوں مگر وہ ترک مجھے پھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید تمھاری اس دن کی پھٹکار نے اس کے سر سے عشق کا بھوت اتار دیا ہے۔

بھگوان کرے کہ ایسا ہی ہو ورنہ میری زندگی نرک ہو جائے گی کوئی

اچھا خاندان مجھے بہو بنانے پر تیار نہ ہو گا۔ لوگ مجھے ایک دیشیا کی طرح سمجھنے لگیں گے اور جیتے جی مجھے جوانی کی چتا پر خود کو بھینٹ چڑھانا پڑے گا۔

بھینٹ چڑھیں تمھارے دشمن تم بالکل چنتا نہ کرنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتا رہا۔ "لاجونتی" کے لئے یہ واقعہ ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا۔ البتہ کبھی کبھار جب اسے اپنے گھر کی یاد آتی تو بڑے میاں کا مقدس چہرہ لاجونتی کی یادوں کے دریچے پر دستک دے جاتا اور وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک بے نام سی خلش میں مبتلا ہو کر رہ جاتی۔

آج کئی دنوں کے بعد روپ وتی "لاجونتی" سے ملنے آئی۔ لاجو! ایک ہفتہ بعد یہاں کا سالانہ میلہ شروع ہو رہا ہے۔ ایک ہفتہ بعد متھرا کی ہر گلی کوچہ دولہن کی طرح سجادی جائے گی۔ خاص کر بڑا مندر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہو گا۔ جب سے مندر کے نئے پجاری شری گوپال جی ہوئے ہیں اس مندر پر بڑی بہار آ گئی۔ متھرا کا سالانہ میلہ اس سے پہلے شاید تم نے نہ دیکھا ہو۔

گئے سال تو میں متھرا ہی تھی۔ لیکن ان دنوں مجھے بخار آ رہا تھا۔ اس لئے میلہ کی گھما گھمی میں نہ دیکھ سکی۔ ہاں نئے پجاری کے بارے میں بھی بہت دن سے سن رہی ہوں۔ کئی بار تو من میں آیا کہ تم کو لے کر چلوں کم سے کم درشن ہی کر لوں مگر سوچ ہی سوچ کر رہ گئی۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ کنواری کنیاؤں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے اور نہ ہی انھیں اپنا چرن چھونے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ

اور کہاں تک جھوٹ ہے دن رات دھیان گیان میں لگے رہتے ہیں۔ ہر دم بھگوان کی سیوا بھگوان کی یاد بھگوان کا ذکر بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھگوان کے سوا اب دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں شہر والے تو بہت ہی خوش ہیں جس کو دیکھو نئے پجاری کا گیت گا رہا ہے۔ ہر شخص ان کا نام احترام سے لیتا ہے بعض لوگ تو ایسا بھی کہتے ہیں کہ شری گوپال جی بھگوان کے نئے اوتار ہیں ایسے مہا پرش کے درشن کے لیئے اپنا من تو بہت زیادہ بیاکل ہے سنتا ہے کہ اس میلے میں وہ کنواری کنیاؤں کو اپنا چرن چھونے دیں گے۔ لاجو! تم تیار رہنا۔ اس سال کا یہ یادگار میلہ میں تمھیں ضرور دکھلاؤں گی۔

میں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہوں۔ بس خوشی کی زیادتی میں تم مجھے بھول نہ جانا۔ مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں۔ میں مندر اور پجاری جی کا درشن بڑے شانتی سے کرنا چاہتی ہوں بھاگم بھاگ میں کچھ مزہ نہیں آئے گا۔

آج متھرا کی سج دھج پورے شباب پر ہے بڑے صبر آزما انتظار کے بعد وہ دن آ ہی گیا۔ جو متھرا والوں کے لیئے خوشیوں مسرتوں اور شادمانیوں کا سیلاب لیکر آتا ہے۔ ہر طرف سے آدمیوں کا سیلاب ہے کہ بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ہر شخص خوش ہے کیا مرد کیا عورت کیا بچے کیا بوڑھے، خاص کر کنواری کنیاؤں کا اضطراب شوق تو بس دیکھنے کی چیز ہے۔ متھرا کا سارا حشر آج شری گوپال جی مہاراج کے مندر کی سمت کرچلا آیا ہے۔ پانی پہ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی طرح خرام ناز سے نسیم سحر کی طرح عورتوں کا خوبصورت جتھا سینکڑوں دلوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتا ہوا مندر میں داخل ہونے لگا۔ عورتیں ایک طرف سے مندر میں داخل ہوتیں۔ بھگوان کی مورتی پر ہار پھول ڈالتیں اس کے بعد بڑے پجاری کے چرنوں کو چھو کر ان کا آشیرواد لیتیں اور دوسرے

راستے سے نکل جاتیں۔ یہ سلسلہ صبح ہی سے چل رہا تھا۔ دن کے تیسرے پہر جب عورتوں کی بھیڑ ختم ہوئی تو سب سے اخیر میں لاجونتی اپنی پیاری سہیلی روپ وتی کو لیکر مندر میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے بھگوان کی مورتی پر پھول چڑھایا پھر پوجا پاٹ کیا۔ اس کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نئے پجاری شری گوپال جی کی طرف بڑھی۔ پہلے روپ وتی نے چرنوں کو چھو کر آشیرواد لیا۔ وہ پجاری کی شخصیت سے بہت مرعوب دکھائی دے رہی تھی۔ لاجونتی جوں ہی پجاری کے قدموں کی طرف بڑھی ایک جھٹکے کے ساتھ پجاری نے پاؤں سمیٹ لئے۔ اور اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا: نہیں نہیں!! تم ہمارا پاؤں چومنے کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہو بلکہ میرے دل کے سنگھاسن پر حکومت کرنے کے لئے۔ یہ سنکر لاجونتی ہکا بکا رہ گئی اور عالم حیرت میں اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑے غور سے پجاری کی طرف دیکھنے لگی۔ پجاری نے مسکراتے ہوئے پرشفقت لہجے میں کہا پہچاننے کی کوشش کررہی ہو اتنا سنتے ہی اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ یادوں کے دریچے کھلتے گئے جسم کی تمام حسیات اس کی آنکھوں میں آگئیں تصور میں ماتھے پر قشقے کی جگہ سجدے کا نشان اور داڑھی سے بے نیاز چہرے پر خوبصورت و پروقار داڑھی سے بھرا ہوا وہ چہرہ نظر آنے لگا جو بہت دنوں پہلے سر راہ یہ کوتا پڑھتا ہوا نظر آیا تھا ؎

خوشا رسوائی وحالے تباہے
سر راہے وآہے یک نگاہے

اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا آ آ آپ!! اس کا ذہن دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی کہ مسلمانوں کا مذہبی

پیشوا اتنے بڑے مندر کا پجاری کیونکر ہو سکا؟ اس سے زیادہ وہ کچھ سوچ نہ سکی اس کا ذہن تاریک ہوتا چلا گیا اور وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ روپ وتی اور پجاری دونوں نے اُسے لپک کر سنبھالا۔ منھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ہوش آیا ابھی اسکی حیرت کا طلسم ٹوٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ پجاری نے کہنا شروع کیا۔ بات زیادہ دنوں کی ہوگئی۔ شاید تمھیں یاد نہ ہو۔ ایک دن اِسی متھرا میں سرِ راہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا تھا۔ میری عمر اور داڑھی کا طعنہ دیتے ہوئے تم نے مجھے بُری طرح رسوا کیا تھا اس پر مجھے اس زندگی میں پہلی بار انتہائی غیرت اور ندامت محسوس ہوئی تھی۔ میں نے صرف تمھارے لئے دُنیا بھر کی ذلتوں اور رسوائیوں کو اپنا مقدر بنا لیا تھا۔ اپنے مذہب کا سب سے بڑا اعزاز ٹھکرا کر صرف تمھاری ایک جھلک کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ میں نے تمھاری خاطر اپنے دل پر بڑے سے بڑا زخم برداشت کر لیا لیکن تمھارے ہاتھوں اس دن کی بے عزتی پر تڑپ اٹھا میں تمھیں پانے کے لئے اپنی خوشحال اور مطمئن زندگی سے اتنی دور آچکا تھا کہ اب واپسی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عالمانہ وقار کو قربان کیا۔ لوگوں کی نگاہوں میں دھرم سے بے دھرم ہوا۔ تم نے اپنی بدنامی کے ڈر سے اپنے وطن کو چھوڑ کر کرشن مراری کے شہر متھرا میں پناہ لیا۔ اور مجھے میری جان بے تاب نے بے گھر و بے در کر کے چھوڑا۔ اتنی دور سے میں صرف تمھاری خاطر اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر متھرا میں داخل ہوا۔ مجھ پر رحم کھانے کے بجائے بڑی بے آبروئی کے ساتھ تم نے مجھے دھتکار دیا۔ میرے دردِ دل کو نہیں سمجھا۔ مذہب وسماج نے تمھیں مجبوریوں کی چہار دیواری میں قید کر دیا مگر میرے عشق جنوں خیز کی سرحدوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ تم میں کسی جوگن کا جذبہ

انگڑائیاں نہ لے سکا جبکہ قیس و فرہاد نے میرے جذبے کو نئی راہ پر لا پٹکا۔ یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں آج ہندو دھرم کے سب سے بڑے منصب پر براجمان ہوں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک مسلمان عالم متھرا کے مندر کا بڑا پروہت بھی بن سکتا ہے۔

تو کیا آپ نے میرے لیے اپنا مذہب بھی بدل دیا ؟

بظاہر تو میں نہ صرف ہندو بلکہ ہندوؤں کا سب سے بڑا پیشوا ہوں مگر خدا گواہ آج بھی میری زات کی تنہائی میرے سجدوں سے آباد ہے رات کے سناٹے میں جب اپنے ماضی کی طرف پلٹتا ہوں تو آہوں آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ سویرا کر دیتا ہوں مگر سورج کی ہر کرن تمھیں حاصل کرنے کا جنون انگیز جذبہ مجھے نئی ہمت عطا کرتی ہے یہ میرے جذبے کی تڑپ ہی تو ہے جو تمھیں یہاں تک کھینچ لائی۔

لیکن آپ مولوی سے پجاری کیسے بن گئے ؟ روپ وتی نے جھجکتے ہوئے سوال کیا ؟

دو لفظوں میں تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ میرے جذبے کی تڑپ نے مجھے مولوی سے پجاری بنا دیا۔

اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کے سچے پیار میں آپ مولوی سے پجاری بن گئے۔ مگر بنے کیسے ؟ یہ جاننا چاہتی ہوں ؟

اب سے تقریباً دو برس پہلے جب لاجونتی نے مجھے سرِ راہ ذلیل و رسوا کر کے میری عمر اور داڑھی کا مذاق اڑایا تھا۔ اس حادثے نے مجھے ہلا ڈالا اور قریب تھا کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ملک کے کسی دور دراز گوشے میں جا چھپتا۔ مگر پھر اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے جذبے نے مجھے

ایک نئی طاقت اور نیا حوصلہ عطا کیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک خطرناک ترین فیصلہ کر ڈالا۔ بالآخر میں نے زندگی ہی داؤں پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے میں نے داڑھی منڈائی۔ ماتھے پر سجدے کی نشان کی جگہ قشقہ لگایا اور گلے میں زنار ڈال کر اسی مندر میں بڑے پجاری مہاراج کے پاس آگیا۔ پجاری جی نے مجھ پر رحم کھاتے ہوئے مندر میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ مندر کی صاف صفائی اور پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی لگن کے ساتھ انجام دینی شروع کی اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے پجاری جی سے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ عربی فارسی اردو کا عالم تو میں پہلے ہی سے تھا۔ وہی فطرت ذہانت میرے کام آئی اور بہت جلد میں نے ہندی پر عبور حاصل کر لیا۔ اور ساتھ ہی پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی اپنائیت و خلوص کے ساتھ کرنی شروع کی۔ پجاری جی میری خدمات سے متاثر ہونے لگے۔ اب وہ مجھ پر خصوصی توجہ دینے لگے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے میں ان کا معتمد خاص ہو گیا۔ ادھر قدم قدم پر قسمت میرا ساتھ دینے لگی۔ لاجونتی کو حاصل کرنے کا مقصد ہمیشہ میرے سامنے رات دن جاگتے ہوئے کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جو اس سنگدل کی یاد سے خالی ہو۔ میں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے جو خطرناک ترین قدم اٹھا چکا تھا اس کا مجھے بری طرح سے احساس تھا۔ ذرا بھی سن گن لگ جاتی تو میری ہڈیوں کا پتہ تک نہ چلتا۔ سب سے زیادہ اذیت ناک میرے لیے یہ احساس تھا کہ ایک عورت کے لیے میں نے زندگی کو داؤں پر لگایا ہی تھا ایمان کو بھی عشق نامراد کی اس بھٹی میں ڈال دیا۔ اگرچہ میرا دل مطمئن تھا۔ اسلامی عقیدے پر میرا ایمان اٹل تھا مگر کفر کی ظاہری شکل و صورت اختیار کر لینے کے بعد مجھ میں رہ بھی

کیا گیا مگر وہ جس نے مجھے عقل وخرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ مجھ سے میری زندگی کی ساری خوشیاں چھین جانے کے بعد بھی میں اس کے دل میں اپنے لئے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا کر سکا تنہائی اور حسرت و بے بسی کے عالم میں پھوٹ پھوٹ کے روتا۔ جب دل کی بھڑاس نکل جاتی تو جلوۂ یار کے تصور میں گم ہو جاتا اور جھوم جھوم کے پڑھتا ؎

بیاد دلربا خوشحال می باش گہے افضل گہے گوپال می باش

اوہ میں جذبات کی رو میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پجاری جی میری خدمت، ذہانت، دُنیا سے بے تعلقی اور گیان دھیان سے اس قدر متأثر ہوئے کہ انھوں نے مرتے وقت مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ چنانچہ آج مجھے تم اس منصب پر دیکھ رہی ہو یہ میری خدمات کا صلہ اور پجاری جی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔

پجاری بن جانے کے بعد میرے لئے لاجونتی کو حاصل کرنا کچھ دُشوار نہیں تھا لیکن میں اپنی بے لوث قربانیوں سے اس کے دِل کو جیتنا چاہتا تھا تاکہ میرے عشق کو ہوس کا نام نہ دیا جا سکے میں نے دو برس کا یہ طویل عرصہ کانٹوں اور انگاروں کی سیج پر گذارا ہے۔

مہاراج! اب بس کیجئے اب زیادہ سننے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے یہ کہتی ہوئی لاجونتی پجاری کے قدموں پر گر پڑی اور روتے ہوئے کہنے لگی کہ مجھے کیا معلوم آپ میرے لیے اتنی بڑی قربانی دیں گے، اتنی بڑی تپسیا کریں گے مجھے معاف کر دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی داسی بن کر رہوں گی اگر آپ ہندو ہیں تو میں ہندو ہوں اور اگر آپ مسلمان ہیں تو میں مسلمان ہوں۔ رو رہا میری جان! تم بھی معاف کر دینا۔ میں نادان تھی۔ مجھے نہیں

معلوم تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لیئے اتنی بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ میں نے اس سچی محبت کی قدر نہ کی اسے ہوس سمجھ کر ٹھکراتی رہی آج میری آنکھوں سے پردے اٹھ گئے ہیں۔ اُٹھئے مندر کی اس چہار دیواری سے کسی ایسی طرف چل نکلیں جہاں ہم مکمل آزاد ہوں"۔

ایک صبح حسبِ معمول مندر کی گھنٹی بجنے میں تاخیر ہوئی۔ بڑے پجاری کے نائب نے انتظار کے بعد مندر کے معمولات کو پورا کیا اپنے کام سے فارغ ہو کر جب دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھلتا چلا گیا کمرہ خالی نظر آیا۔ پجاری کو بہت تلاش کیا مگر پجاری پھر کبھی نظر نہ آیا۔

یہ کہانی ہے "مولانا محمد افضل جھنجھانوی" کی جو کمالاتِ ظاہری سے آراستہ اردو ہندی، عربی فارسی کے زبردست عالم اور نامور شاعر گذرے ہیں۔ علی قلی خاں یاغستانی نے اپنی مشہور کتاب "ریاض الشعراء" میں مولانا کو ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔ تذکرہ میر حسن میں بھی آپ کا ذکر ملتا ہے۔ بڑی عمر میں ایک ہندو لڑکی پر ایسے عاشق ہوئے کہ اس کی خاطر انھیں بڑے بڑے انقلابات سے گذرنا پڑا۔ انجام کار وہ مولانا کی قربانیوں سے متاثر ہوئی اسلام قبول کیا اور آپ کے نکاح میں آئی۔ مولانا نے اپنے عشق کی سرمستیوں کو بارہ ماسہ عرف بگٹ کہانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بارہ ماسہ دراصل ہندی طرز کی ایک منظوم داستان ہے جو ہجراں نصیبی اور درد و فراق کی پُرالم داستان پر مشتمل ہے۔ افضل کے بارہ ماسہ کی زبان بہت قدیم ہے۔ اور شمالی ہند کے اُردو نظموں کی اولین شکلوں کی ایک شکل ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان کافی سلیس ہے اس نظم میں فارسی کی بندشیں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ تو

آدھا تیتر آدھا بٹیر کی جلوہ نمائی ہے ؎

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں		جتن کیا عشق کے غم کا پچاروں
جنوں در ملک جانا جھنڈا اگر ڈ اِیا		سمجھ اور بوجھ کا تھانہ اٹھایا
چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے		مرم بایک دگر کہتے و سنتے
چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں		مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

فارسیت کے اپنے غلبے کے باوجود بارہ ماسہ جذبات کے اعتبار سے خالص ہندی کا ایک شاہکار ہے جس میں ہندوانہ طرز معاشرت کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔

مولانا افضل کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا

یہ عشق نہیں آساں تو جس کو سمجھتا ہے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بھیگی پلکوں کا بوجھ

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

لیکن تصویرِ کائنات کا یہ رنگ اسکی نگاہوں میں دھندلا پڑ چکا تھا۔ نصف بہتر سپردگی کا تمامتر انداز لیئے دعوتِ عمل بنی ہوئی تھی۔ حیات اپنی تمامتر رعنائیوں، رنگینیوں، دلفریبیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ مگر اس کے ساتھ وہ اعتناء نہ کرسکا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بڑا متقی تھا بلکہ اس لیئے کہ شباب کی تمامتر مسرتیں اور جذبۂ دروں کی جنوں خیزی اس کے لیئے صرف لمحاتی ثابت ہوئیں ۔

کھلی جو آنکھ تو پھر زادِ راحلہ نہ رہا

ایک بچے کا باپ ہونے کے بعد وہ دوسرا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ قوتِ مردمی کا وہ خزانہ (جس سے تصویرِ کائنات خوش رنگ نظر آتی ہے) خالی ہو چکا تھا۔ جس وقت اس پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ سوجان سے کانپ اُٹھا پچیس سال کی عمر کوئی بڑھاپے کی عمر تو نہیں ہوتی۔ اپنی عمر سے کم بیوی جو اب تک صرف ایک بچے کی ماں بن سکی تھی۔ آنے والی پہاڑ سی طویل زندگی کے رُوح فرسا تصوّرات نے اسکے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ بیوی پر اس کمزوری کے اظہار سے پہلے اندر اندر اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

شرم و ندامت میں ڈوب کر بالآخر ایک دن بڑی ہمت سے کام لیکر مری ہوئی آواز میں اٹکتے جھجکتے اسے اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنی بیوی پر کرنا پڑا۔ سنتے ہی وہ دم بخود ہوکر رہ گئی۔ گریۂ بے اختیار سے اسکی پلکیں نم آلود ہوگئیں چونکہ وہ رفیقِ حیات تھی۔ صرف شریکِ عیش و نشاط نہیں۔ مشرقی لڑکیاں خصوصًا دیہات کی پتی ورتا میں بہت آگے ہوتی ہیں۔ ان کی ضمیر میں وفاداری کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ نمائش و الہانہ پن، طرح داری، عشوہ طرازی کے بجائے سادہ لوحی کے ساتھ وفاداری ان کا خاص وصف ہوتا ہے۔ ابتلاء و آزمائش کے وقت ان کی وفاداریوں کی سمت بہت کم بدلتی ہے سے

ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہیئے ٭ لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

آنکھیں دکھانے، سرد مہری کا مظاہرہ کرنے اور جلی کٹی سنانے کے بجائے اس نے اپنے شوہر سے عملی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ تسلی دیتے ہوئے سمجھایا آپ گھبرائیں نہیں یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ آپ دوا کرائیں۔ خدا نے ہر بیماری کا علاج پیدا کیا ہے تو کیا اس کا علاج پیدا نہیں کیا ہوگا؟ آپ پوری کوشش کریں چاہے جتنا روپیہ خرچ ہو۔ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل! وہ پھر آجائے گا اور میرے لئے بالکل فکر نہ کریں۔ میں کل بھی آپ کی تھی۔ آج بھی آپ کی ہوں۔ اور کل بھی صرف اور صرف آپ کی رہوں گی۔ یہ نقصان تنہا آپ کا نہیں۔ میں اس میں برابر کی شریک ہوں۔ دکھ کا یہ بوجھ اٹھانے میں آپ تنہا نہیں، یہ درد مشترک ہے میں آپ کی بیوی ہوں، جورو ہوں،

دکھ سکھ آرام تکلیف کی ساتھی۔

بیوی کی ان تسلی آمیز باتوں سے اسے بڑا سکون ملا۔ پھر تو علاج معالجے میں اپنی سکت بھر کوشش میں لگ گیا۔ مگر ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اپنی توفیق کے مطابق ایک سے ایک سیانے، حکیم، ڈاکٹر سب کو دکھا کر تھک گیا مگر کسی طرف سے روشنی کی کوئی کرن نہیں دکھائی دی۔ شفاء نام کی چیز ہمیشہ اس سے دس قدم دور رہی۔ اب تو اس کا بچہ بھی بڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر کھیلتا بھاگتا۔ بیوی نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اس کا ساتھ دیا مگر کہیں سے چارہ گری نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے تھک ہار کر مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں اس کا دل ڈوب کر رہ گیا ؎

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں

اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے

دنیا کے حکیموں، ویدوں، ڈاکٹروں اور سیانوں سے جب وہ مایوس ہو گیا تو اسے خدا رستوں کی یاد آئی۔ بالآخر ایک دانا آدمی کے مشورے پر وہ ایک اللہ والے، کی بارگاہ تک پہونچ ہی گیا۔ اللہ کے اس مقبول بندے کی صورت دیکھ کر اس کی بے قراری کو قرار آیا۔ اس کی مقدس پیشانی سے سعادت کی صبحیں طلوع ہو رہی تھی اور پر نور سراپا سے ولایت کی بزرگی، پادشاہی، جہانگیری اور اقبال مندی کا آفتاب ہویدا تھا ؎

اے صبح سعادت ز جبین تو ہویدا

جمال و زیبائی، سطوت و جبروت اور جاہ و جلال کا ایسا پیکر مجسم کہ دل خود ہی اسکی طرف کھینچتا جائے ؎

کرشمہ دامن دل می کشد جا ایں جا است

اور اگر چند صحبتیں نصیب ہو جائیں تو دلِ نیاز پیشہ کا اخلاص رنگ لائے تو پھر ؎

ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے

ایسا پر وقار سراپا، ایسی صاحب اثر و نفوذ شخصیت، ایسا صاحب فضل و کمال، سنتِ نبوی اور شریعتِ مطہرہ کا اس قدر التزام شوق رکھنے والا۔ اس سے اچھا اچھے اچھوں نے کم ہی دیکھا ہوگا ع

تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

اور وہ بیچارہ تو تھا ہی ایک عام سا آدمی۔ کئی دن تک دور ہی دور سے دیکھتا رہا۔ کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ کر سکا وفا آشنا بیوی ساتھ ہی ساتھ تھی۔ حالات کی کڑی دھوپ نے اسے وقت سے پہلے سنجیدہ، بُردبار اور متین بنا دیا تھا۔ اس کے کھُودنے، اُکسانے، حوصلہ دلانے پر جھجکتے اٹکتے اُسے ہمت بھی ہوئی تو وہ اس مردِ درویش نگہ التفات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا کئی دن بیت گئے، مگر وہ مردِ خدا مست اسے ٹالتا رہا۔ لوگوں کو اس سے زیادہ اس کی بیوی پر ترس آتا جو اس کے پیچھے بَن کی کوئل بن چکی تھی۔

مزاج شناسوں نے دونوں میاں بیوی کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ تم لوگ مایوس یا بددل نہ ہونا۔ دیر لگ سکتی ہے لیکن اپنے مقصد میں تم ضرور کامیاب ہوؤ گے۔ لاکھ ٹالے جاؤ، بہلائے جاؤ، ڈانٹے پھٹکارے جاؤ۔ ٹس سے مس مت ہونا، تمھارے جیسے جانے کتنے پریشان حال لوگ آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ بہلائے جاتے ہیں، پھر ٹالے جاتے ہیں، پھر ڈانٹے اور پھٹکارے جاتے ہیں، پھر بھگائے جاتے ہیں، ذلتوں

ان آزار کو جو لوگ جھیل جاتے ہیں وہ اپنی منزل پا لیتے ہیں اور جنھیں اپنی اناؤں کے مجروح ہونے کا احساس شدید تر ہوتا ہے۔ حرماں نصیبی ان کا مقدر بنجاتی ہے۔ پھر تو ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

بالآخر ایک دن رحمتوں کا سویرا ہوا۔ مشیّتِ ایزدی کو اس پریشان حال دیہاتی پر رحم آ گیا۔ قبولیت و اجابت کی ساعتِ سعید کی وہ مبارک منزل آ ہی پہونچی کہ جہاں پر ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کا اجالا پھیلتا ہے۔

مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا وہ قدسی صفات بندہ اپنے معمولات سے فارغ ہو کر بسترِ ناز پر تشریف فرما ہو چکا تھا۔ سفید بے داغ بستر پر سرہانے پیتانے دو دو سفید تکیے! شمع کو پروانوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ آہستگی اور شستگی کے ساتھ میٹھے مدھر لہجے میں سلسلۂ کلام جاری تھا۔ لبہائے ناز پر دلآویز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں اسی کرموں جلے کی آواز ابھری! اے حضور! ہمیں اچھا کر دیجئے۔"

"کون ہو بھائی؟"

"میں ہوں عبد العزیز سرکار"

"کہاں رہتے ہو؟"

"راج نیپال میں سونی برگدوا ایک گاؤں ہے وہیں کا رہنے والا ہوں۔ حضور! میں بہت پریشان حال ہوں۔ اپنی سکت بھر دوا دارو کر کے تھک چکا ہوں حکیموں، ڈاکٹروں کی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بڑی آس لے کر آپ کے پاس

آیا ہوں۔ مجھ پر رحم کریں میرے لئے دُعا کریں"۔

"ارے بھائی عبدالعزیز ! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس لائق ہوں؟ اگر میں اس لائق ہوتا تو خود ہی اچھا نہ ہو جاتا؟ آئے دن حکیم قیصر کے یہاں نا چار جاتا رہتا ہوں دوا کرانے کے لیئے۔ جاؤ مولانا لوگوں سے دُعا کراؤ وہ نائبِ رسول ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن کی دُعائیں زیادہ قبول کرتا ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ میں کس لائق ہوں؟"

بڑی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے اسے ٹالا۔ مگر وہ بدھو بھی اتنا دن رہتے ہوئے نیم ہوشیار ہو چکا تھا اور بھائی لوگوں نے سکھا پڑھا کر کسی حد تک پکا کر دیا تھا۔ خوشگوار موڈ اور زیرِ لب تبسّم نے اُسے حوصلہ بخشا۔ بڑے سادگی اور بھولے پن سے کہنے لگا "اچھا حضور ! تو روپیہ لیکر اچھا کر دیجئے"۔ اس کی سادہ لوحی نے اہلِ محفل کو زعفران زار کر دیا۔ آپ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے مسکراتے ہوئے فرمایا "ہاں دوست ! یہ بات تم نے کام کی کی ہے۔ آخر میرے بھی بال بچے ہیں۔ دس بیس آدمی آئے دن مہمان ہوتے ہیں۔ اتنے لوگ آتے جاتے ہیں مگر تم ہی ایک کام کے آدمی نکلے۔ اور سب کو تو صرف اپنی غرض سے غرض ہوتی ہے۔ میری ضرورتوں کے لیے نہیں سوچتے۔ اپنی کوئی تجارت نہیں، کوئی کھیتی باڑی نہیں۔ کوئی ملازمت نہیں آخر اتنا لمبا خرچ۔ چلو اگر کسی نے نہیں تو تم نے تو سوچا۔ شاباش میرے دوست ! اچھا بتاؤ تو سہی کتنا روپیہ دے رہے ہو اچھا کرائی؟"

"دو سَو روپے لے لیجئے حضور ! اور ہمیں اچھا کر دیجئے"

"بھلا دو سو روپے سے کیا ہوگا؟ اتنے سے کون سا کام بنے گا؟ اگر یہی بات ہے تو تم مجھ سے چار سو روپے لے کر مجھے اچھا کر دو۔ کم از کم حکیم قیصر کے

یہاں جانے آنے سے تو فرصت مل جائے (اپنے خادم خاص چودھری دوست محمد سے فرمایا)، چودھری صاحب عبدالعزیز بھائی کو چار سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کر دیں۔"

"اچھا سرکار! چار سو روپے لے لیجئے مگر ہمیں ضرور اچھا کر دیجئے۔"

"چودھری صاحب! بھائی عبدالعزیز کو آٹھ سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کر دیں" اب تو غریب بہت حیران و پریشان ہوا کہ اب کیا ہوگا؟ یہاں تو ڈبل بولی بولی جاتی ہے۔ مگر وہ ہمت نہیں ہارا۔ اہلِ محفل اس مکالمے سے کچھ ہنس رہے تھے کچھ مسکرا رہے تھے اور کچھ اس کی سادہ لوحی اور بے وقوفی پر ترس کھا رہے تھے۔ ایکبار پھر وہ ہمت کر کے روتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "حضور! دوا کرانے میں بڑا روپیہ خرچ ہو گیا۔ میری ساری ترڑی تابڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب پائی پائی میرے پاس صرف چھ سو روپے بچے ہیں۔ یہی لے لیجئے اور ہمیں اچھا کر دیجئے" اتنا کہہ کر رو پڑا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ اسکی اس کیفیت اور کہنے کے انداز نے محفل پر سناٹا طاری کر دیا۔ آپ بھی خاموش ہو گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس مردِ خدا مست پر ڈھیروں برف ڈال دیا ہو۔ کیونکہ ایسے لوگ بڑے سے بڑا غم برداشت کر سکتے ہیں، بڑی سے بڑی کلفتیں اور اذیتیں خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جاتے ہیں مگر کسی غریب کی "بھیگی پلکوں کا بوجھ" ان سے نہیں اٹھتا ہے ؎

اشک میرے ہیں مگر دیدۂ نم ہے اس کا

یہی ان نفوسِ قدسیہ کے گھر کی ریت رہی ہے۔ یہی ان کا وطیرہ رہا اور یہی روایت! تھوڑی دیر تک بڑا بوجھل سناٹا طاری تھا کہ اللہ کے

اس برگزیدہ بندے کی آواز ابھری "عبدالعزیز! جی سرکار! ادھر دیکھو وہ کنویں پر جو نالی بنی ہے اس پر بیٹھ کر نمازی لوگ وضو کرتے ہیں۔ کل صبح تم اس نالی کے اندر جو بھی کچرا کائی ہو اُسے صاف کیا کرو۔ تم کو ثواب بھی ملے گا کہ ایک طرح سے نمازیوں کی خدمت ہوتی ہے۔ اور ادھر دیکھو اس کونے میں ایک گونی لٹکی ہوئی ہے احاطہ پاک میں یا باہر راستے میں عربی و فارسی، اردو میں لکھا ہوا کوئی کاغذ پڑا دیکھو تو اسے اٹھا کر اس بوری میں ڈال دیا کرو۔ بس جاؤ"

اس کی دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ ڈیوٹی پر لگ چکا ہے۔ جب دیکھو نالی صاف کرتا نظر آتا یا احاطہ پاک میں لکھا ہوا زمین پر پڑا کاغذ چنتا ہوا ملتا۔

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ پھر حاضر ہوا۔ بارگاہِ کرم میں حاضری کا تو انداز وہی تھا مگر چہرے کی صحت و توانائی کی سرخی اور سکون و مسرت کا پھیلا ہوا اجالا بتا رہا تھا کہ اس کی محرومیوں کے طویل شب کی صبح ہو گئی۔ زندگی سے بھرپور آواز میں عرض کرنے لگا۔

"حضور! اب ہمیں چھٹی دے دیں"

"کیوں بھئی عبدالعزیز! کیا تم اچھے ہو گئے؟"

"ہاں سرکار ہم اچھے ہو گئے"۔ ایک دم سے اچھا ہو گیا سرکار جیسے پہلے تھا

ع میرے ہونٹوں پہ تبسم یہ کرم کس کا ہے

"بھائی مبارک ہو۔ اللہ نے تمھیں اپنے فضل سے صحتمند کر دیا۔ اچھا تو پھر کب آؤ گے؟"

"جب جب حضور کا حکم ہو"

"اچھا جاؤ لیکن سال میں ایک بار ضرور آتے رہنا"

"نہیں سرکار! ہم تو سال میں کئی بار حاضری دیں گے"

"کئی بار تو تم آ ہی نہیں سکتے۔ کسان آدمی ہو فرصت ہی کم ملے گی۔ مگر سالانہ بھنڈارے (جلسے) میں تم ضرور آنا اور اس حاضری کو اپنا معمول بنالینا"

وہ غریب خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ آپ کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوگیا۔

سہ نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

یوں تو خوش بختیاں، فیروزمندیاں، ارجمندیاں خود ہی اس کی بارگاہ ناز میں چشم و ابرو کی منتظر رہا کرتیں، اس کی برکتوں کے فیضان نے تیرہ بختیوں کو بخت رسا اور محروموں کو خوش نصیب بنادیا۔ پستیاں اس کے قدموں سے لپٹ کر نقطۂ عروج کا اعزاز حاصل کرتیں۔ کتنے کنگلے فقیر چرواہے اس کی ایک نگہ کیمیا اثر سے مسند اعزاز کے صدر نشین بن گئے۔ مگر وہ آج خود اپنے نصیبے کی ارجمندی پر نازاں ہے۔ جسکی ایک نگہ التفات کے لیئے امیر، رئیس، منصب دار، رجواڑے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ آج وہ خود عالم سرخوشی میں سراپا نیاز بنا ہوا ہے کہ اس کے صحن حرم وہ تشریف لایا (خواب ہی میں سہی) جو اقلیم ولایت اور کائناتِ عشق کا تاجدار تھا، عالم اسلام کا ہستئ معتبر تھا، بحر تدقیق و تحقیق کا شناور تھا۔ علوم و فنون کا شہسوار تھا۔ فضل و کمال کا شہریار تھا، ملت بیضا، کا محافظ، اسلام کا حامی و ناصر اور ناموس رسالت کا پہریدار تھا۔ جس نے محبت رسول کے کشت ویراں کو لالہ زار کیا۔ دل کی ریگزار وادیوں میں عقیدت کے چشمے جاری کئے دشتِ وحشت میں محبت کے پھول کھلائے۔ دلِ خانما برباد کو آباد کیا۔ بادِ مخالف

کا رخ موڑا۔ اور آندھیوں کی زد پر عشق کا چراغ جلایا۔ جو اپنے آقا کی چوکھٹ کا گدا مگر اپنی مسندِ فیض وعطا پر سلطانِ عشق تھا۔ جس کے عشقِ جاں سوز کی صدائے دلنواز ایک گوشے سے ابھری، پھر دیکھتے ہی دیکھتے برِ صغیر کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے اقصائے عالم پر چھا گئی۔ برِ اعظم ایشیا، یورپ، امریکہ افریقہ جدھر دیکھئے۔ دیوانوں کی محفل میں وہی "بلبلِ ہزار داستان" نوا سنج نظر آتا ہے ؏

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

جسے دُنیائے عرب وعجم کے اربابِ علم ودانش اور اصحابِ فضل وکمال نے بڑے احترام وعقیدت کے ساتھ "مجدد اعظم اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی" سے یاد فرمایا۔

کہا جاتا ہے کہ عام بندۂ مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصّہ ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی مقبولِ بارگاہِ حق خواب دیکھتا ہے تو خواب سے زیادہ حقیقتوں کا نقشہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ رونما ہونے والے اہم ترین امورِ غیبیہ کا روشن آئینہ اس کے ہاتھوں میں دے کر قدرت واضح انداز میں اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ ؏

جن کے رُتبے ہیں سوا ان کے سوا مشکل ہے

اس نے دیکھا کہ اس کی خانقاہ کے وسیع برآمدے میں اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی تشریف لائے ہیں۔ وہ "احمد رضا" جن کا انتظار بارگاہِ رسالت پناہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں بھی ہوتا رہا۔ عبقری الشرق عالمِ اسلام کی عظیم المرتبت ہستی نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس کی خانقاہ کو عزت بخشی ہے۔ ابھی وہ تشریف لا کر بیٹھے ہی تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے

آپ کے گرد انسانوں کا کثیر مجمع ہوگیا اور لوگوں نے ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا ۔ آنکھوں میں احترام و عقیدت کی چمک کے بجائے خصومت و غضب کی ہوس ہے پھر ہر طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا اور بتدریج اس میں جارحیت پیدا ہوتی گئی ۔ آپ ہر ایک کو دلائل و براہین کی روشنی میں مسکت جواب دیتے ہیں ۔ دندان شکن جواب سن کر بجائے خاموش ہو جانے یا مان لینے کے کٹ حجتی پر اتر آتے ہیں ۔ اگر ایک طرف سے سوالات کا سلسلہ کچھ نرم پڑتا تو فوراً دوسری طرف جارحانہ یورش شروع ہو جاتی ۔ آپ تن تنہا بدخواہوں ، شورش پسندوں کے نرغے میں ہر طرف سے سوالات جارحانہ کی مسلسل یلغار کیلئے ان حملوں کی دفاع میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور وہ مرد جاں نثار عالم اضطراب میں کبھی آپ کے دائیں بائیں کبھی آگے پیچھے ہوتا رہا ۔ بالآخر تھوڑی دیر کے بعد شکست کی ذلتوں سے دوچار ہو کر وہ سب راہ فرار اختیار کرتے ہیں ۔

بدخواہوں ، بدمذہبوں ، شورہ پشتوں کے بھاگ جانے کے بعد جب قدرے سکون ہوا تو اس آبروئے عشق و وفا نے مسکراتے ہوئے فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ تمھیں جزائے خیر عطا فرمائے ۔ دشمنوں کے نرغے میں تمھارا وجود بڑا غنیمت ثابت ہوا ۔ مگر اضطراری کیفیت میں تمھارا بار بار میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ہونے کا کیا مطلب تھا ؟

حضور والا ! برصغیر ہند میں آپ کی ذات علم و یقین ، عشق و عرفان کا سرچشمہ ہے ۔ برصغیر میں ناموس رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گرد آپ کی زبان و قلم نے بڑا سخت پہرہ قائم کر رکھا ہے ۔ عشق رسالت کے

ساتھ ناموسِ رسالت کی پہیداری کا اعزاز بھی حضور والا کو حاصل ہے۔ میں نے اپنے طور پر محسوس کیا کہ ان ظالموں کی نیت اچھی نہیں اور اس چشمۂ فیض کو نقصان پہونچانے کے درپے آزار ہیں تو جسطرف ہجوم زیادہ ہوجاتا تھا میں اسی طرف ہوجاتا تھا کہ مبادا آپ کی ذات والا صفات کو وہ کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو میں آپ کی ڈھال بن جاؤں۔ اگر میرے گھر میں حضور کی ذات کو ذرا بھی نقصان پہونچ جاتا تو میں اپنے کو زندگی بھر معاف نہیں کرتا۔ اور کہیں بارگاہ رسالت سے جواب طلبی ہوجاتی کہ اپنے گھر میں تو میرے عاشق و جاں نثار اور میرے ناموس کے پہریدار کی حفاظت نہ کرسکا؟ تو پھر کیا جواب دیتا؟ اس لیے میں نے طے کرلیا تھا کہ اپنی حیات کی آخری سانس تک آپ پر آنچ آنے نہیں دوں گا۔ یہی سب سوچ کر کبھی حضور کے آگے کبھی دائیں کبھی بائیں ہوجاتا تھا۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے اس گنہگار بندے کی لاج رکھ لی۔

رات کے پچھلے پہر جب آپ کی آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد عشق و وفا کی خوشبو محسوس کی۔ رات کے خواب کا نقشہ سطح ذہن پر ابھرتا چلا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد جب تعبیر کی فکر ہوئی تو معًا تصور میں ایک جھماکہ ہوا کہ یہ خواب سے زیادہ مشیت کا واضح اشارہ ہے کہ یہاں ایک دینی قلعہ تعمیر کیا جائے جسمیں قرآن وحدیث کی تعلیم اور دین پاک مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترویج واشاعت ہو۔ بالخصوص مسلک اعلیحضرت امام احمد رضا (جو دراصل مذہب اہل سنت اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ ہے) کی نشر واشاعت کی جائے خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی! تاکہ اسلام وسنیت کا اجالا چاروں طرف پھیل جائے۔ چنانچہ کافی غور وخوض کے بعد اپنے وسیع وعریض خانقاہ

میں ایک دارالعلوم کی بُنیاد رکھی۔ چودہویں صدی کے نصفِ آخر کے پہلے عشرے میں دُور دُور سے علماء و مدرسین بلائے گئے۔ اور پھر خالص اس روحانیت کی آماجگاہ میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دلنواز بلند ہونے لگی۔ اسکی نیت کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ ایسے ماحول میں جبکہ ادارے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی اپنے باپ دادا کے نام سے منسوب ہوتے تھے اس نے خالص رضائے الٰہی و عشقِ رسالت پناہی کے پیشِ نظر اپنے بیکراں اخلاص کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے اس "ذات جامع الصفات" کے نام منسوب کیا جس نے گیتی کی زلف برہم سنواری، حیات کا چہرہ نکھارا، اور انسانیت کی مُردہ رگوں میں زندگی کا گرم گرم لہو عطا کیا۔ ظلم وجہل کی تاریکیوں میں علم و یقین کا اجالا پھیلایا اور ساری کائنات کو عرفان و آگہی کی دولت سے مالامال کر دیا۔ معلمِ کائنات، محسنِ کائنات حضور پرنور روحی فداہ جنابِ احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبتِ گرامی سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام دارالعلوم فیضُ الرّسول رکھا۔

استاذ الاساتذہ مجمع البحرین حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی سابق شیخ الحدیث فیض الرسول براؤں شریف نے استفسار فرمایا۔ حضور والا! فی زمانہ اکثر دیکھنے میں آیا کہ لوگ اپنے اداروں کے نام اپنے نام پر رکھتے ہیں تو اس ادارے کا نام "مدرسہ یار علویہ" رکھنے کے بجائے "فیض الرسول" کیوں رکھا؟"

آپ نے فرمایا مولانا درس وتدریس کا یہ دینی ادارہ در اصل سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا فیض ہی فیض ہے اس لیے اس کا نام "فیضُ الرسول" ہی مناسب تھا۔ اپنے نام ونمود کو دخل

دینے سے اخلاص باقی نہیں رہ جاتا ہے

ہو گئی دل کو تیری یاد سے اک نسبتِ خاص

اب تو شاید ہی میسّر کبھی تنہائی ہو

جس دور میں آپ نے "فیض الرسول" کی بنیاد رکھی۔ اطراف و جوانب میں دور دور تک جہالت کی تاریکی کا یہ عالم تھا کہ نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیئے صحیح تلفظ سے عاری معمولی پڑھے لکھے آدمی کی تلاش میں کئی کئی گاؤں کا چکر لگانا پڑتا۔ اس پر بھی خوش نصیبی سے کوئی مل جاتا تو سبحان اللہ ورنہ بغیر نمازِ جنازہ پڑھے میت کو دفن کر دیا جاتا۔ اور قبر کے سرھانے ایک لکڑی گاڑ دی جاتی جو اس بات کی علامت ہوتی کہ اس قبر میں جو میت مدفون ہے اسکی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے اگر حسنِ اتفاق سے کوئی پڑھا لکھا آدمی اس قبر سے گذرے تو صاحبِ قبر کی نمازِ جنازہ پڑھ دے۔ فیا للعجب۔

اور آج فیض الرسول کے فیضان کی برکت ہے کہ بستی، گونڈہ، علاقہ بھانبھر، نیپال کے بارڈر سے لیکر اندرون نیپال تک علم کا اجالا ہی اجالا ہے گاؤں گاؤں مدرسے مکاتب اور علمائے دین کی بہتات ہے۔ علاقائی و ضلعی سطح سے بہت آگے دور دور تک اندرون ملک فیض الرسول کا چشمۂ فیض جاری و ساری ہے۔ اور اب تو بیرونِ ملک بھی فیض الرسول کے فیض کا چشمۂ سیّال لہریں لینے لگا۔ اللّٰھمّ زد فزد۔

ھندوستان میں چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ابتداء میں طبقۂ صوفیاء میں آپ پہلے فرد ہیں جنھوں نے اپنی خانقاہ کو شریعت و طریقت کا بہترین سنگم بنایا۔ خالص روحانیت کے ماحول میں علمائے شریعت کو دینِ پاکِ مصطفےٰ صلے اللہ تعالےٰ علیہ و آلہ وسلم کی ترویج واشاعت

کے لیے جمع فرما کر ان کا ایسا اعزاز و اکرام فرمایا کہ مدارس اسلامیہ کے ارباب بست و کشاد کی طویل فہرست میں اس کی مثال نایاب کی حد تک کمیاب ہے اس مردِ خدامست کے اخلاص بے پایاں کا نتیجہ ہے کہ فیض الرسول آج اسلامی علوم کا ایک شہر بن چکا ہے۔ اپنی چند در چند امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر ہندوستان بھر میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج پورے ملک میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے بعد اپنے، الہ و ما علیہ کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا وہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ عوام تو دور رہے خواص کو بھی جانے دیجئے اخص الخصصین کا وہ طبقہ جن کی شخصیت آفاقی اور جن کے فکر و نظر پر سوادِ اعظم اہل سنت وجماعت کو اعتماد ہے ان کا اعتراف و رجوع اس بات کا غماز ہے کہ اس مردِ خدا آگاہ کے اخلاص بے پایاں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

شوال المکرم ۱۴۰۶ھ میں سلسلۂ اشرفیہ کے تاجدار، اکابر علماء کرام کے مرکزِ عقیدت حضرت علامہ سید مختار اشرف صاحب قبلہ اشرفی جیلانی سجادہ نشین سرکار کلاں کچھوچھہ شریف کا اپنے پوتے کی تعلیم و تربیت کے لیے "فیض الرسول" کا خصوصی انتخاب حضرت مولانا سید نعیم اشرف والدِ گرامی حضرت مولانا سید کلیم اشرف جائسی کا اپنے ذہین ترین و بلند اقبال شہزادگان سید علیم اشرف و سید قسیم اشرف کی تعلیم و تربیت کے لیے فیض الرسول کو پسند فرمایا۔ اہل سنت کے قیمتی سرمایہ، زبان و قلم کے بادشاہ، صاحبِ فکر و نظر، اردو اور مذہبی ادب کی آبرو، حضرت علامہ ارشد القادری کا اپنے لڑکے اور فیض العارفین مولانا غلام آسی برادرِ اکبر علامہ ارشد القادری کا اپنے نواسے کی تعلیم و تربیت کے لیے "فیض الرسول

کا انتخاب ! ـــــ یہ فیضُ الرسُول کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے جو در اصل
اسی مردِ درویش کی رُوحانیت کی جلوہ سامانیاں ہیں ؎

یہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اسمِ گرامی :- آپ کا اسمِ گرامی شاہ محمد یار علی ابنِ فجر علی ہے ستائیسویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ سے ہوتا ہوا مولائے کائنات شیرِ خدا مشکل کشا حضرت مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے جا ملتا ہے اور اٹھارویں پشت میں آپ کے جدِّ اعلیٰ اور سلطان الشہداء حضرت سید سالار مسعود غازی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دادا ایک ہو جاتے ہیں آپ کا سن ولادت ۱۳۰۷ھ اور سال وفات ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء جمعرات کا دن گذر کر شب میں ایک بجکر پچیس منٹ پر ہے۔ کل عمر شریف اسی برس۔

وطن مالوف :- یو پی کے مشہور ضلع بستی میں شہر بستی سے جانب شمال ساٹھ کلو میٹر دور! بانسی تحصیل سے جانب مغرب نو میل ایک مقام براؤں شریف ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ ہندوستان میں قیام کے لیے پہلی بار بارہ بنکی آئے۔ چنانچہ سلطان الشہداء حضرت سید سالار مسعود غازی کے والدِ گرامی سالار ساہو جو سلطان محمود غزنوی کے ایک نامور جرنیل تھے (جن کے عقد میں محمود غزنوی کی بہن اور سلطان ناصر الدین سبکتگین کی بیٹی بی بی ستر معلی تھیں جو سید سالار مسعود غازی کی والدہ تھیں) ان کا مزار پاک بارہ بنکی کے مشہور قصبہ سترکھ میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔
پھر وہاں سے منتقل ہو کر میر پور بہرائچ آباد ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء

سے پونے دو صدی پیشتر آپ کے دادا خورشید علی نے میرپور بہرائچ کو چھوڑ کر براؤں شریف کی مستقل سکونت اختیار کی۔

بایں ہمہ نسبی کرامت آپ نے حسب و نسب کو کبھی اپنے لیے باعث افتخار نہیں جانا بلکہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اور وَلَا فَضْلَ لِلْعَرَبِیِّ عَلَی الْعَجَمِیِّ وَلَا لِلْعَجَمِیِّ عَلَی الْعَرَبِیِّ کُلُّکُمْ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنَ التُّرَابِ کے مطابق آپ نے حسب و نسب کے بُت کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے ہی نہیں دیا کہ اسلام میں بزرگی کا معیار کبھی بھی خالص حسب و نسب نہ رہا۔ بلکہ بزرگی کے لئے سب سے بڑا معیار خشیت الٰہی و تقویٰ خداوندی مانا گیا ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بو العجبی است

اس لیے اگر کوئی آپ سے حسب و نسب کے متعلق پوچھتا تو آپ فرماتے "میں ایک گنہ گار سُنّی مسلمان ہوں"۔ اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے والہانہ لگاؤ اور شدید جذباتی وابستگی تھی کہ دونوں کا قدر مشترک "عشق رسول" تھا۔ اگرچہ زمانہ پاتے ہوئے ظاہری ملاقات نہ ہو سکی۔ ماتھے کی آنکھوں سے اعلیحضرت علیہ الرحمہ کو نہیں دیکھا تھا۔ عشاق بارگاہِ رسالت کے قافلہ سالار حضرت خواجہ اویس قرنی نے بھی زمانہ پاتے ہوئے حدیبہ کہ مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے باوجود سید السادات فخر موجودات آقائے کائنات سرکار رسالت مآب صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ماتھے کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا کسی دیکھنے والے سے ان کا جذبۂ سوز دروں کم تھا؟ یہ تپ سینۂ سوزاں ہی کا توفیضان تھا کہ انھیں بارگاہِ رسالت سے خلعت زیبا عطا ہوئی اور ہمیشہ کے لیے عشق

کی سروری کا اعزاز عطا ہوا۔

ان کے سچے نائب اور برصغیر ہند میں کاروانِ عشق کے سپہ سالارِ اعظم سیّدنا امام احمد رضا کو شعیبُ الاولیاء شاہ محمد یار علی نے ماتھے کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو کیا ہوا؟ اپنے خانۂ دل میں آپ کی عقیدت و محبت کا جو چراغ آپ نے جلا رکھا تھا۔ علمِ دین کی اشاعت اور عشقِ رسول کی تبلیغ الحبّ فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ کا عملی مظاہرہ جو اعلیٰحضرت کا مشن خاص تھا۔ صوفیاء و عرفاء کے طبقے میں اس کی طرح کس نے آگے بڑھ کر اس غیر معمولی بوجھ کو اپنے توانا اور مضبوط کاندھے پر اٹھایا؟ اور گھر گھر علمِ دین و محبتِ رسول کا اجالا پھیلایا ؎

مرحبا اے عشقِ خوش سودائے ما
اے دوائے جملہ علتہائے ما

شیر بیشۂ سنت حضرت علامہ حشمت علی خان لکھنوی سے قلبی لگاؤ دراصل یہ سرکار اعلیٰحضرت سے بیکراں عقیدت کا شاخسانہ تھا۔ بستی، گونڈہ، فیض آباد نانپارہ وغیرہ اپنے مریدوں میں شیرِ حق کو لے کر دورہ کیا، جگہ جگہ جلسے منعقد کرائے۔ جلسوں، مناظروں، مقدموں میں شیرِ حق کا بھرپور تعاون اور حقِ رفاقت ادا کیا۔

ولادتِ رسول صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم کے موقع پر براؤں شریف میں بڑے عظیم پیمانے پر جشن مناتے، خوش عقیدہ مسلمانوں کا تاریخی اجتماع ہوتا۔ جلیل القدر علمائے کرام کی تقریریں ہوتیں۔ کتب فروشوں سے سرکارِ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت کی سیکڑوں روپے کی کتابیں لیکر مفت تقسیم فرماتے۔

ہندوستان کے اپنے تاریخی سفر میں اپنے مرکزِ عقیدت سلطانِ عشق سیدنا امام احمد رضا کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ فاتحہ خوانی کے وقت آپ کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں بند چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ؎

لب وا ہیں آنکھیں بند ہیں پھیلی ہیں جھولیاں
کتنے مزے کی بھیک تیرے پاک در کی ہے

حضور والا نے اپنی زبان فیض ترجمان سے خود ہی بیان فرمایا۔ "اعلیحضرت امام اہلسنت کے مزار پاک پر حاضری و فاتحہ خوانی کے وقت مجھ پر ایک گہری کیفیت طاری تھی جس کا نقشہ میں الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ عارف باللہ، عاشق رسول، عالم باعمل، مجدد دین و ملت کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ؎

نہ دوری دلیل صبوری بود
کہ بسیار دوری ضروری بود

خطیبِ مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کا خراجِ عقیدت ملاحظہ ہو:-

"شیخ المشایخ شعیب الاولیا، عارف حق حضرت علامہ صوفی شاہ محمد یار علی علیہ الرحمۃ والرضوان اس صدی کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی ولایت و بزرگی کو اکثر علمائے کرام و مشائخ عظام اور بے شمار عوام و خواص نے تسلیم کیا۔ مجھے بھی اس کا شرف حاصل ہے کہ میں نے انکا زمانہ ہی نہیں پایا۔ بلکہ متعدد بار ان کی زیارت سے مشرف ہوا۔ نانپارہ (بہرائچ) کے ایک تاریخی اجلاس میں (جو حضرت علیہ الرحمۃ

کے زیرِ صدارت تھا) جسمیں مناظر شیر بیشۂ اہلسنت مظہر اعلیٰحضرت مولانا حشمت علی خانصاحب لکھنوی علیہ الرحمۃ والرضوان بھی شریک تھے۔ رئیس نانپارہ حاجی ضیاء اللہ صاحب کا دولت کدہ ہم سب کی قیام گاہ تھا۔ اس سفر میں حضرت علیہ الرحمۃ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور ان کے اخلاص ومحاسن اور خرد نوازی سے بیحد متأثر ہوا۔ وہ ایک متصلب سُنّی صحیح العقیدہ مُردِ درویش ہی نہ تھے بلکہ سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے والہانہ عشق بھی رکھتے تھے۔ یہی وہ قدرِ مشترک تھا جس نے حضرت شیر بیشۂ اہلِ سنت اور حضرت شیخ المشائخ کو قریب تر کردیا تھا۔ چنانچہ وہ زندگی کی آخری سانس تک مسلکِ اعلیٰحضرت کے نمائندہ وترجمان تھے۔

تنزّل و انحطاط کے اس ہوشربا دور میں جبکہ دھیرے دھیرے خانقاہوں سے علم اٹھتا جارہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے دارالعلوم فیض الرسول کی بنیاد ڈال کر اپنی خانقاہ کو علمِ ظاہر و باطن کا سنگم بنادیا اور علمائے حق کا کارواں اتار کر علم کا ایسا چراغ روشن کیا ہے جو ہمیشہ کے لیئے ان کی علمی یادگار بن گیا۔"

(سوانح حیات شیخ المشائخ :۔ از مولانا نسیم بستوی)

عبادت وریاضت :۔ عبادت وریاضت، زہد واتقاء، قناعت واستغناء خاصانِ خدا کے یہ زیور ہوتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی سیرت میں ان سب کا تذکرہ بطورِ خاص ملتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی عبادت وریاضت، توکل واستغناء، قدم قدم پر شریعتِ مطہرہ کا احترام والتزام بالخصوص نماز باجماعت تکبیر اولٰے کی پابندی یہ آپ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ متعدد بار حج وزیارت کے

وقت بھی آپ اپنے اس معمول پر کاربند رہے۔ یہاں تک کہ جب اپنے سلسلے کے مشائخین کی زیارت کی نیت سے ہندوستان کا تاریخی سفر فرمایا۔ تو اس میں بھی نماز باجماعت تکبیر اولے کا اہتمام بطور خاص پیش نظر رہا۔ آپ کے اس وصف خاص کی بڑی شہرت ہے کہ آپ چالیس برس سے زائد نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر سختی کے ساتھ کاربند رہے۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی آخری نماز مرض الموت کے عالم میں پڑھی وہ بھی نماز باجماعت تکبیر اولے کے ساتھ۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذٰلک۔

نماز فجر کے بعد جب مصافحہ فرماتے تو مصلیان مسجد جو خاص کر اساتذہ وطلبہ ہی ہوتے اُن کو بڑی پابندی کے ساتھ یہ تلقین فرماتے۔ "میاں نماز تو نماز۔ جماعت تو جماعت۔ بات تو جب ہے کہ تکبیر اولیٰ نہ چھوٹے یہی نماز اللہ سے ملا دیتی ہے"۔ آپ کی دوستی و دشمنی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی روشنی میں ہوتی۔ اپنے ملنے والوں واہل عقیدت وارادت کو ہمیشہ یہ نصیحت فرماتے "میاں کسی سے دوستی کرو تو اللہ کے لئے اور کسی سے دشمنی کرو تو اللہ کے لئے اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں"۔ ہر نماز پنجگانہ کے لیئے آپ اس قدر اہتمام فرماتے کہ دوسرے لوگ عید بقرعید کی نماز کے وہ اہتمام نہ کر پاتے۔

آپ کی مسجد: مسجدیں تو دُنیا میں ایک سے ایک بنیں، بنتی ہیں اور بنتی رہیں گی۔ اپنی شوکت وعظمت فن تعمیر کے اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ آپ نے بھی اپنی وسیع خانقاہ میں ایک مسجد بنائی، جو فن تعمیر اور ہیئت صوری کے اعتبار سے اسے غیر معمولی نہیں۔ البتہ جس عہد اور دیہات کے ماحول کے اعتبار سے اسے قابل ذکر کہا جا سکتا ہے۔

مگر اس کے لئے آپ نے جس خلوص بے پایاں، اہتمام بیکراں اور احترام فراواں کا مظاہرہ فرمایا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال کے لیے دُور دُور تک تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تمامتر تزئین و آرائش کے ساتھ پہلی اینٹ سے لیکر آخری اینٹ تک نماز باجماعت تکبیر اُولیٰ پر بنی ہے یہاں تک کہ اگر کسی دن مغرب کی اذان ہوگئی اور کام کرنے والے کاریگر میناریے کی بلندیوں پر ہیں تو آپ تکبیر تحریمہ کے لیے اس وقت تک اَللّٰہُ اکبَر نہیں کہتے جب تک کاریگر پیچھے کھڑے ہو کر یہ نہیں دیتے کہ ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ اور کاریگر بھی کیسے؟ فاسق وفاجر نہیں! بلکہ متشرع اور پانچ وقت کے نمازی۔ اور اگر اتفاقیہ کسی دن کسی کاریگر کی ایک رکعت بھی نماز باجماعت چھوٹ جاتی تو اُس دن اس کاریگر کو کام سے روک دیتے مگر دن بھر کی پوری اُجرت عطا فرماتے فجزاہُ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

اللہ رب العزت کے گھر کی تعمیر میں حضرت شاہ صاحب نے جو زبردست احترام فرمایا اس کی جزا انھیں دینے والا رب جانے یا لینے والا جانے۔ مگر دنیا نے تو یہ دیکھا کہ ان کے عظیم الشان خوبصورت اور پرشکوہ روضے کی تعمیر اُن کے مُرید مخلص الحاج سیٹھ محمد یوسف و برادران رئیس نانپارہ (بہرائچ) نے اپنے جیب خاص سے کرایا تو اس بات کا خاص اہتمام فرمایا کہ ان کے روضے کی تعمیر بھی نماز باجماعت تکبیر اولےٰ پر ہو۔ روضے کی تعمیر میں ایک طویل عرصہ لگا لیکن کسی دن

اگر کسی کاریگر کی اتفاقاً جماعت کی ایک رکعت بھی چھوٹ جاتی تو الحاج سیٹھ محمد یوسف صاحب اس دن کاریگر کو کام کرنے سے روک دیتے مگر دن بھر کی پوری اجرت دیتے۔ اور یہ کہکر خوش ہوتے کہ جس نے خدا کے گھر کو اس قدر اہتمام واحترام کے ساتھ بنایا اس کے گھر کو بھی تقریباً اسی اہتمام کے ساتھ بنایا جائے گا۔

علوم دینیہ کی نشر واشاعت سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت پر کافی زور دیتے ہوئے فرمایا۔

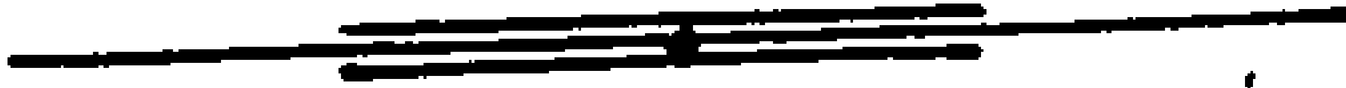
تعلیمی ادارے قائم کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اوّل اس لیے کہ شریعت کے بغیر طریقت حاصل نہیں ہوسکتی۔ دوسرے اس لیے کہ انبیاء ومرسلین صرف نماز روزے اور اوراد ووظائف ہی کے لیے دنیا میں تشریف نہیں لائے بلکہ عبادات واعمال کے ساتھ دینی تعلیمات کی اشاعت کے لئے بھی بھیجے گئے۔ نماز، روزے، اوراد ووظائف سے آدمی خود تو سنبھل سکتا ہے لیکن دوسروں کو سنبھالنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔"

اسی ضرورت کے تحت آپ نے اپنی خانقاہ میں دارالعلوم فیض الرسول کی بنیاد رکھی اور اپنی حیات ہی میں اسے پروان چڑھانے کی کامیاب جدوجہد کی۔

اسے اسلام وسنیت کی اشاعت وعشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ایک اہم مرکز بنایا۔ ان کے پسماندگان میں شہزادگان، اساتذہ اور ارباب بست وکشاد نے اپنے خون جگر سے اسے نقطۂ عروج کا اعزاز بخشا۔ اور آج تو اس کے اجالوں سے ایک جہاں روشن ہے۔ پس

خدائے بزرگ و برتر ان کے تربتِ انور پر دن رات لگاتار رحمت و نور کی بارش برسائے ؎

اے ارضِ براؤں تیری عظمت کے تصدق
سینہ ترا آرام گہِ یارِ علی ہے
ہر ایک بلا دور ہوئی نام سے اُن کے
ہر ایک وبا ان کے تصور سے ٹلی ہے



دیوتا کی شکستی

شدھی تحریک کو کچلنے کے لیے جماعتِ اہلسنت کے علماء و مشائخ دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی واستقلال کے ساتھ طوفانِ بلا خیز کا رخ موڑ کر اُمتِ مسلمہ کو ایک تباہی سے بچالیا۔

دسمبر کی سرد ترین رات کا پچھلا پہر، ہر سو سناٹا اور کہر کی دھند میں لپٹی ہوئی پھیکی چاندنی! پنڈت دیانند کو صبح بھور میں اُٹھنے کی دیرینہ عادت تھی۔ کیا گرمی کیا جاڑا، اپنی عادت کے مُطابق وہ صبح سویرے اٹھ کر رفع حاجت کے لئے نکل جاتا۔ روزانہ کی طرح وہ آج بھی ہاتھ میں لوٹا لئے ہوئے گاؤں سے باہر نکل کر وہ پیپل کے اس تناور درخت کے نیچے سے گذر جانا چاہتا تھا جس کے نیچے سے وہ ہمیشہ گذرا کرتا تھا۔ وہ بچپن سے سُنتا آیا تھا پیپل کے مقدس درخت پر بھگوان براجمان ہوا کرتے ہیں۔ اس وہم کو وہ زندگی بھر اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ دن رات جب کبھی اس پیپل کے درخت پر نظر پڑتی تو بڑی عقیدت کے ساتھ نظریں بچا کر ایک لمحہ کے لئے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیتا۔

روکھی پھیکی چاندنی اور کہر کے دھند میں لپٹے ہوئے پیپل کے درخت کے نیچے پنڈت دیانند کو ایک غیر معمولی ہیولیٰ نظر آیا۔ جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈرتے جھجکتے بمشکل تمام چند قدم آگے بڑھا۔ ہیولے کی صورت تھوڑی سی واضح ہوئی۔ پنڈت کی گھگھی بندھ گئی۔ غیر ارادی چیخ پر وہ قابو نہ پا سکا۔ خوف و دہشت سے اس کے جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

یوں تو جاڑے کی لمبی رات میں صبح تڑکے ہی نیند پوری ہو جایا کرتی ہے مگر کاہلی اور سستی سے لوگ لحافوں میں گھسے رہتے ہیں۔ پنڈت کی اضطراری چیخ نے قریبی گھروں کے لوگوں کو بستر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی آوازوں کے ساتھ ہر طرف سے لوگوں نے پنڈت کو گھیر لیا۔ کئی آدمیوں کے ساتھ ایکبار پھر پنڈت ہمت کر کے درخت کی طرف بڑھا۔ دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا پھیکی چاندنی دم توڑ رہی تھی۔ پیپل کے نیچے اتنا اجالا پھیل چکا تھا کہ چند قدم کے فاصلے سے لوگ واضح طور پر کچھ دیکھ سکیں۔

پنڈت اور اس کے ساتھیوں نے پیپل کے نیچے جو کچھ دیکھا وہ ان کے حواس باختہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر پنڈت نے بہت جلد اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ تحیر خیز مسرت کے عالم میں وہ گرتا پڑتا گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ وفورِ مسرت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی بھگوان آ گئے۔ دیوتا جی نے اپنے پیارے پیارے چرنوں سے ہمارے بھومی کو پوتر کر دیا۔ صبح ہی صبح جس نے بھی پنڈت کی

اچنبھے سے پوچھا :- دیوتا جی کہاں ہیں؟ کس کے یہاں ؟

پیپل کے نیچے! پیپل کے نیچے! جلدی جاؤ- فوراً پہنچو ! کی صدا لگاتا، ہانپتا، کانپتا، پھولتا پچکتا- کالی چرن کے گھر پہونچا-

کالی چرن!...... او کالی چرن، ارے کالی چرن کے بچے! جلدی نکل !

کالی چرن آنکھیں ملتا ہوا حیرانی کے عالم میں باہر نکلا- ارے پنڈت جی مہاراج ! اتنے سویرے سویرے اور وہ بھی ہم جیسے آدمی کے گھر پر ! خیریت تو !

ارے دیوانے سب "کشل منگل" ہے میں تجھے آج سچا دھارمک بنانے آیا ہوں- تو سب سے زیادہ میرا مذاق اڑایا کرتا تھا-

کیسا مذاق ، پنڈت جی !

بھول گئے میری ہر بات کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہو- خاص کر جب کبھی پیپل کے درخت کو سیس نوا کر پرنام کرتے دیکھ لیتے ہو تو اس دن جینا دوبھر کر دیتے ہو- وہ تو میں پھر بھی کروں گا- بھلا پنڈت جی مہاراج! یہ کوئی بات ہوئی جو تم کہتے ہو کہ پیپل کے درخت پر بھگوان بیٹھا کرتے ہیں تو کیا بھگوان کو پدھارنے کے لئے پیپل ہی کا درخت ملا تھا- بھگوان کو پدھارنا ہی ہوگا تو آم، امرود، جامن، سیتا پھل وغیرہ کے پیڑ پر بیٹھیں گے جس پر پھل فروٹ میوہ مستھان ہوتا ہے نہ کہ پیپل کے اوپر جو نہ زندے میں نہ مردے میں-

کالی چرن کی چبھتی ہوئی باتوں سے پنڈت کو طرارہ آگیا اور پیار بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا :- ارے نادان بالک !کیوں اپنے ایمان

ستیا ناس کرتا ہے۔ چل آج تیری آنکھوں کی پٹی کھل جائے گی۔ بھگوان نے میری بنتی سن لی ہے۔ میری تپسیا کی لاج رکھ لی ہے۔ تمھیں جیسے نادان بالکوں کے ایمان بچانے اور تمھاری آنکھیں کھولنے کے لئے بھگوان نے اپنے سنگھاسن کو چھوڑ کر تم جیسے پاپیوں اور ردوشیوں کو پوتر اور نردوش بنانے کے لئے پیپل کے نیچے آنے کی کرپا کی ہے چلو اپنی بیل جیسی آنکھوں سے دیوتا کی شکتی کو دیکھ کر اپنا ایمان ٹھیک کرلو۔ پنڈت یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے مڑا۔

کالی چرن بھی حیرانی کے عالم میں پنڈت کے پیچھے چلنے لگا۔ گاؤں سے باہر نکل کر پیپل کے نیچے دیوتا کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔

قدآور اور توانا جسم، داڑھی اور مونچھوں سے بھرا ہوا بے حد دلکش چہرہ، ماتھے پر قشقہ، گلے میں چندن کی مالا - ایک پاؤں پر کھڑے، دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکائے، آنکھیں بند کئے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز! شخصیت کی دلآویزی اور پروقار سراپا نے ہر ایک کو سحر زدہ کر دیا۔ آن کی آن میں یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہر چہار جانب سے انسانوں کے قافلے جھنڈ در جھنڈ آنا شروع ہو گئے۔ بدایوں کے مضافات میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دیوتا کی بھینٹ کے لیے ہر کوئی کچھ نہ کچھ لئے چلا آرہا تھا۔ دودھ، مکھن، گھی، ملائی، لاوی، مٹھائی، پوڑی، سہاری غرض بوڑھے جوان، امیر و غریب، سب حسب توفیق اپنی عقیدتوں کی سوغات لیے دیوتا کے حضور میں حاضر

ہو گئے۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام، مگر دیوتا کی ہیئت کذائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی ایک پاؤں پر ہاتھ جوڑے، سر جھکائے، آنکھیں بند، اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز! پھر رات آئی اور صبح بھی ہوئی اور دوپہر کا وقت بھی ہو گیا مگر دیوتا اپنی ہیئت پر قائم رہا۔ لوگ اٹھ بیٹھ، کھاپی کر بے حال ہوتے جاتے تھے۔ مگر دیوتا پر ٹھنڈی گرمی، بھوک و پیاس اور تھکاوٹ کا کوئی اثر نہ تھا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ لالہ گوپی ناتھ سے رہا نہ گیا۔ آس پاس کے آدمیوں سے پوچھنے لگا۔ بھائیو! دیوتا جی گوشت پوست کے بنے ہیں یا پتھر کے۔ نہ کھانا نہ پینا، نہ سردی نہ گرمی نہ تھکاوٹ ایک پاؤں پر آخر کب تک کھڑے رہیں گے؟

چپ رہئے لالہ جی! آپ انھیں دیوتا بھی مانتے ہیں اور ایسے شبد بھی منہ سے نکالتے ہیں۔ ارے دیوتا بھی اگر ہمارے اور آپ کی طرح دھان پان سے ہوں تو ہم میں اور دیوتا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ اپنی اُتم شکتی کی وجہ سے یہ مہان ہوتے ہیں۔ ابھی تو صرف ایک رات اور ایک دن ہی ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کب تک وہ یونہی اپنی دیا سے ہم دوشیوں اور مہا پاپیوں کے من کی کھوٹ کو اپنے شبھ درشن سے دھو کر ہماری بیاکل آتماؤں کا اپکار کریں گے؟ یہ اُن کی کرپا ہے کہ انھوں نے ہم تن کے اجلے من کے کالوں کو اپنا درشن دیا اور راج سنگھاسن کو چھوڑ کر ہم غریب داسیوں کے یہاں پدھارے۔ رام چندر لانے لالہ جی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ پھر لالہ جی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ اچھا لالہ جی! ایک بات بتائیے کہ آپ نے اس سے پہلے بھی اتنا پیارا، اتنا سندر، اتنا من موہن مکھڑا دیکھا تھا؟ قسم بھگوان کی چندرما بھی تو دیکھ کر شرما جاتا ہو گا۔

دیوتا کو ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے دُوسرا دن بھی ختم ہو گیا۔ انسانوں کا ہجوم ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پجاریوں اور پنڈتوں نے دیوتا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ بھجن اور ناقوس کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور پھر پوری رات بھی اس ہیئت کذائی پر ختم ہو گئی۔ کھانے پینے اور مختصر آرام کرنے کے بجائے پنڈتوں کی حالت ابتر ہو رہی تھی، چڑھاؤں اور نذرانوں کی لالچ اور دیوتا کے تقدس نے ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ وہ گڑگڑا رہے تھے۔ مہاراج! آنکھیں کھول دیں۔ اپنے داس داسیوں اور سیوکوں پر ایک نظر ڈال کر ان کے ہردے کو شانت کر دیں۔

تیسرے دن کا سورج جب دوپہر کی مسافت طے کرنے کے قریب پہونچا تو دیوتا نے آنکھیں کھولی۔ سُرخ اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرخ سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ پجاری کپکپا اٹھے۔ ان کے سارے وجود میں وہ آنکھیں دھنستی محسوس ہوئی۔ مجال نہیں کہ دیوتا سے آنکھیں ملا لیتے۔ بس آنکھ نیچی کئے ہوئے گرم دودھ کا پیالہ دیا۔ پے درپے کئی پیالے پینے کے بعد دیوتا نے آسودہ سی ڈکار لی۔ اور آہستگی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

بھگوان نے آنکھیں کھول دیں۔ دیوتا جی زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ خبر سارے مجمع میں پھیل گئی۔ انسانوں کے اس سیلاب میں نئے سرے سے پھر ہلچل مچ گئی۔ جی بھر کر دیوتا کو دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ پنڈت اور پجاری بھیڑ کو دیوتا سے دور رکھنے کے لیے سارا زور ختم کئے دے رہے تھے۔ مگر ان جنم جنم کے پیاسوں کے آگے ان کی ایک نہ

چلی۔ آدمیوں کے ریلے میں پنڈتوں کی حیثیت چند تنکوں سے زیادہ نہ تھی۔ چیخ و پکار اور شور و شار سے ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔

دیوتا کو ان پنڈتوں کی حالت زار پر رحم آ ہی گیا۔ واضح طور پر دیکھ لیا کہ عوام کے بیتابیٔ شوق پر کنٹرول کرنا پجاریوں کی سکت سے باہر ہے۔ بڑے ہی پروقار، پاٹ دار اور گمبھیرتا کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کیا۔

میرے بچو! شانتی اور دھیرج!

میں تمھارے بیچ اتنی سمے ضرور پدھاروں گا جس سے تمھارے منوں کی سبھی کامنائیں شانت ہوجائیں۔

زندگی میں پہلی بار جن سوکھے کانوں تک دیوتا کی شہد بھری آواز پہونچی۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ سبھوں نے فرطِ عقیدت سے دیوتا کے احترام میں مہر بہ لب ہو کر اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں اور چند قدم خود ہی سے دور ہٹ کر چاروں طرف سے دیوتا کو گھیر لیا اور والہانہ انداز میں ایک ٹک دیوتا کو دیکھنے لگے۔ اتنے بھاری بھرکم وجود کو اگر آنکھوں کے راستے دل میں اتار لینا ممکن ہوتا تو کب کا دیوتا کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں سمو کر اپنی حسرت زدہ تمناؤں کو شاد کام کر چکے ہوتے۔ ہر ایک اپنے من کی آنگن میں دیوتا کو ننگے پاؤں چلانے کا آرزومند تھا گویا زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ؏

دل کے آنگن میں خرامِ ناز سے آجائیے

پروانوں کے ہجوم میں دیوتا جی آسن جمائے بیٹھے تھے کہ اچانک اسی درمیان گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائے زمزمہ نواز بلند ہوئی۔ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز! دیوتا کے

گر پہلے ہی خوشی طاری تھی۔ اس صدائے پرسوز نے ایک اور سناٹا مسلط کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اللہ اکبر کی اس صدا نے فضا کے ہر صدا کی لرزش چھین لیا ہو۔ خود دیوتا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں اور ایک محویت کا عالم طاری تھا ۔ جب صدائے سامعہ نواز ختم ہوئی تو دیوتا نے بڑی حیرت سے پوچھا ۔

" ای کاؤ ہووت ہے ؟" (یہ کیا ہو رہا ہے ؟)

پجاریوں نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ " مہاراج ! ای مسلمان لوگن کے اجان ہووت ہے "۔ (مسلمانوں کی اذان ہو رہی ہے)

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی اور دیوتا جی گیان دھیان میں بیٹھ گئے کہ پھر وہی سازِ حیات کو تھرا دینے والی آواز ابھری۔

دیوتا جی نے گھبرا کر پوچھا " اب کاؤ ہووت ہے ؟ (اب کیا ہو رہا ہے ؟)

مہاراج ! آج مسلمان لوگن کے جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کے دن یہ دو بار اجان دیوت ہیں۔ جب لوگن جٹ جاوت ہیں تو پھر اجان دیوت ہیں اور ان کا مولوی کتاب پڑھت ہے تو اب کی یہ اجان کتاب پڑھے کے لئے بھئی ہے۔ کتاب پڑھے کے بعد نماج پڑھت ہیں۔

نماج کاؤ ؟

ایشور کی پرارتھنا ! بھگوان کی پوجا !

یہ سنتے ہی دیوتا ، ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا کہ چلو مسلمانوں

کی پرارتھنا بھی دیکھ لیویں۔ آگے آگے دیوتا مہاراج اور پیچھے پیچھے انسانوں کا سیلاب مسجد کی طرف دیوتا کو والہانہ انداز میں جاتا دیکھ کر انسانوں میں نئے سرے سے ایک بار پھر ہلچل مچ گئی اور آن کی آن میں وسیع وعریض مسجد کے سامنے آدمیوں کا ایک انبوہِ کثیر جمع ہوگیا۔

مسجد کے سامنے ہندوؤں کے اس عظیم اجتماع پر، وہ بھی عین نماز کے وقت، مسلمانوں میں خوف و تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ امامِ مسجد نے صورتِ حال کی نزاکت دیکھ کر ایک مختصر اور پرجوش تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کی گھبراہٹ دور کر کے ان کے خون میں حرارت کی تازہ لہر دوڑا دی۔ پھر نماز شروع ہوئی۔ بخیر و خوبی ختم بھی ہوئی۔ اس درمیان مسلمانوں کی عبادت کے طور و طریقوں نے دیوتا کو بہت متاثر کیا۔ بڑے خاموشی اور محویت کے عالم میں دیوتا جی مسلمانوں کو نماز پڑھتا دیکھتے رہے۔ نماز کے دوران ان کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سی چمک پیدا ہوتی رہی۔ نماز کے بعد مسلمان یکے بعد دیگرے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنا شروع ہوئے کہ اسی وقت دراتہ طور پر دیوتا مسجد کے صحن میں گھستا چلا گیا۔ دیوتا جی کو مسجد میں بے تابانہ گھستے دیکھ کر ہندو مسلمان سب حیران رہ گئے۔ ابھی ان کی حیرت کا طلسم ٹوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دیوتا نے امام صاحب سے کہنا شروع کیا " مہاراج! بھگوان کی یہ پرارتھنا جو آپ لوگن کرت رہیں ہم کا بہت بھائی! بھگوان کے پوجے کا یہ ڈھنگ بہت انوکھا ہے۔ شریر کا ہر ہر انگ ایشور کے آگے" اس جھکت اور ماتھا ٹیکت بہت بھلا جان پڑت ہے۔ ایشور کے پوجے کا یہ اُپائے ہم کا بھی بتائے دیا جائے۔ ہردے میں سمائے گوا۔"

دیوتا کی باتیں سُن کر امام صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جذبات سے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ سوامی جی ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کا کھلے دِل سے سواگت کرتے ہیں اور اس بات سے ہمارے جسم کا رُواں رُواں جھوم اٹھا کہ بالآخر سچے دین کی کشش نے آپ جیسے رشی منی کو بھی خدا جانے تک کھینچ لایا۔ دیر میں جانے کی بجائے حرم کی طرف آپنے رُخ کیا۔ لیکن اس انوکھی عبادت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پاک صاف ہو کر سچے دِل سے صرف ایک خدا اور اس کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (جن کا ذکر ویدوں، پرانوں، سنسکرت کے اشلوکوں اور اپنشدوں اور ہندو دھرم کے مہاپرشوں، بڑے بڑے رشی منیوں کے ان کہنیوں میں موجود ہے۔ توریت، انجیل، زبور، ودیگر آسمانی صحیفوں میں جنکی آمد کی بشارت اور ان کی واضح نشانیاں بتادی گئی ہیں) پر ایمان لاکر زبان سے کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ کر پورے عملی و اعتقادی نظام کو قبول کرے تاکہ وہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر خدا کی بندگی بجائے۔

تو آپ جلدی سے پاک و صاف کر کے مجھے اسلام میں داخل کریں نا !!!!

خدا کو اسی طرح سے پوجنے کے لئے میں بہت بیاکل ہوں۔ دیوتا اور امام صاحب کی اس گفتگو سے لوگ دم بخود تھے۔ خصوصًا پنڈت حضرات ایک نئی افتاد کا سامنا کر رہے تھے۔ اب تک وہ کچھ نہ کچھ طوفان اٹھا چکے ہوتے۔ ہر دور میں فرقہ پرستوں اور مذہبی جنونیوں کی کوئی کمی نہیں رہی مگر دیوتا کی آتم شکتی کو وہ اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ

چکے تھے۔ دیوتا کی سحر طراز شخصیت اور اس کے وقار کا جبروت، نیز عوام کے جذبۂ شوق کی نمود نے انھیں اور حواس باختہ کر رکھا تھا۔ بالآخر دیوتا کے شدید اور پیہم اصرار پر امام صاحب نے حسب معمول کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی دولت لازوال سے دیوتا جی کو سرفراز فرمایا۔ دیوتا کے مسلمان ہوتے ہی اسلام لانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام ہوتے ہوتے سیکڑوں افراد دیوتا کے اتباع میں کلمۂ طیبہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ جس نے جہاں بھی یہ حیران کن خبر سُنی تصدیق کے لئے بھاگا چلا آیا۔ پھر دیوتا کے اسلام لانے کی برکت یہ ہوئی کہ ہزارہا ہزار لوگوں کو حق و صداقت اور یقین کے اجالوں میں اسلام کا کلمۂ طیبہ نصیب ہوا فالحمد للّٰہ علیٰ نعمائہ الکامل[ی]

شدھی تحریک کے دور عروج میں حضرت مولانا قطب الدین برہمچاری علیہ الرحمۃ (عم محترم امام النحو شیخ المنطق شارح بخاری صدر العلماء حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمۃ والرضوان) نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ علوم اسلامیہ کی فراغت سے ایک سال پہلے ہی ہندوانہ وضع قطع اختیار کر کے بنارس کے سب سے بڑے مندر میں ایک دنیا بیزار پجاری کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ مندر کے عملے سے جلد ہی دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ عنفوان شباب میں شخصیت کی دلآویزی، مردانہ حسن و جمال اور پروقار سراپا نے حسب نسب کے معاملے کو بڑی آسانی سے طے کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پنڈتوں اور پجاریوں کے نور نظر ہو گئے۔ حصول علم کی سچی تڑپ اور حسن خدمات نے پجاریوں اور پنڈتوں کو جلد مسخر کر لیا۔ انھیں پجاریوں اور بے حد قابل پنڈتوں سے آپ نے چھوٹی سے لیکر بڑی بڑی کتابیں پڑھنا شروع کیں مسلسل تین برس تک کڑی محنت اور جانفشانی سے ویدانتوں اور پرانوں اور شاستروں پر عبور حاصل

کیا۔ اپنے سینے کو ہندو دھرم کے عجائب و اسرار، حقائق و معلومات کا خزانہ بنا کر مندر سے باہر تشریف لائے۔ علما و مشائخ کی عام روش سے الگ ہٹ کر آپ نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک نیا میدان منتخب کیا اور اس میدان میں آپ بے حد کامیاب رہے۔ اسلام پر خارجی حملوں کے دفاع میں آپ ایک مضبوط اور نا قابل تسخیر چٹان ثابت ہوئے۔ ہندو پنڈتوں، شنکر آچاریوں، آریہ سماجوں سے کامیاب مناظرے کئے۔ مخالف اپنے دھرم پر آپ کی وسعت معلومات دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتا۔ انھیں کی مذہبی کتابوں سے اسلام کی حقانیت کو ایسا آشکارا کرتے کہ مذاہب کی تاریک وادیوں میں بھٹکنے والے مسافروں کی آنکھیں کھل جاتی حق و صداقت کی مشعل دیکھ کر ہزارہا ہزار ہندو آپ کے دست حق پرست پر اسلام لائے سیکڑوں ہزاروں مرتدو کو پھر سے خدا کا کلمہ نصیب ہوا۔

شدھی تحریک نے جب آپ کے عہد میں زور پکڑا تو اس کے لیئے آپ نے کمر ہمت کسی۔ اپنے پیر و مرشد قطب المشائخ حضرت مولانا سید علی حسین اشرفی جیلانی استاذ الکل حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی کے حکم پر ملک کے طول و عرض بالخصوص صوبہ یوپی کا طوفانی دورہ شروع کیا۔ سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔

ارتداد کے اس تیز و تند لہر میں سنا کہ بدایوں یا باندہ کے اطراف میں مسلمان شر دھانند کے فتنے شدھی کا شکار ہو رہے ہیں اور دو ایک مسلمان مرتد بھی ہو گئے ہیں۔ اس خبر وحشت اثر نے آپ

کو تڑپا دیا۔ فوراً اپنے ایک شاگرد کو لے کر اس مقام کے لئے روانہ ہو گئے۔ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے ایک گوشے میں جا کر اپنا مخصوص مشائخانہ لباس اُتار کر یہ تاکید کی کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں یہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔ اس کے بعد آپ نے شام کے دھندلکے میں بھیس بدلا۔ پورے جسم میں بھبھوت ملا۔ ماتھے پر قشقہ گلے میں چندن کی مالا ڈالی۔ ایک دیوتا کا روپ دھارن کیا۔ پھر اس دیوتا کے چمتکار نے ایک مسلمان کے بدلے میں سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل کیا۔ وہ بدنصیب جو شردھانند کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گئے تھے اسلام کی دولت سے وہ بھی شرفیاب ہو گئے۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے یعنی ۱۹۲۳ء میں "شدھی سنگٹھن" تحریک کا آغاز ہوا۔ منصوبہ بند طریقے پر مسلمانوں کو قتل مرتد اور اقتصادی و معاشی طور پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی مہم شروع ہوئی تاکہ برصغیر سے اُن کے وجود کو پاک کر دیا جائے۔ یا اگر رہیں تو اس حال میں کہ خود ان کا وجود ان کے لیے ایک مستقل سوہانِ رُوح بنا رہے۔ آہیں آنسو سسکیاں کراہیں ان کا مقدر بن جائے۔ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے چند بجید متعصب فرقہ پرست جنونیوں نے ہندوؤں، بودھوں، اور سکھوں کے تعاون سے ایک عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنے کے لئے مسلمانوں کے خلاف ایک خوفناک سازش کی۔ پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج نے اس عظیم فتنے کو جنم دیا۔ وہی پنڈت دیانند جس نے ستیارتھ پرکاش

نامی بدنامِ زمانہ کتاب لکھی۔ جس میں اس نے اسلام اور بانیٔ اسلام صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے نکالے بڑے ہی دلآزار پیرائے میں محسن انسانیت صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بارگاہ عظمت پناہ میں گستاخیاں کیں اور بیہودہ الزامات سے اپنے دامن کو داغدار کیا۔ جس کا مسکت، مدلل اور دندان شکن جواب صدرالافاضل فخرالاماثل حضرت علامہ سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے دیا۔ جو مؤقر جریدہ پندرہ روزہ "السواد الاعظم" میں برابر شائع ہوتا رہا ہے۔

تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ترکِ گاؤکشی کی ہلاکت آفرینیوں کے بعد تحریک شدھی سنگٹھن کا فتنہ بڑی شدت کے ساتھ رونما ہوا۔ جس نے اسلامیانِ ہند کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ شروع شروع میں وہ فتنہ ایک آندھی کی شکل میں رونما ہوا۔ دیکھتے دیکھتے طوفان بن گیا اور پھر ۱۹۲۵ء میں دیانند کے صدسالہ تقریب کے موقع پر ہندوستان کے گوشے گوشے سے فرقہ پرست مذہبی جنونیوں کے اجتماع نے اسے بگولے کی شکل دیدی۔ پھر یہیں سے ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی تباہی، معاشی بدحالی، مذہبی زبوں حالی اور ایمان کی تباہی کا ایک ہلاکت خیز دور شروع ہوا۔ صوبہ یوپی خصوصاً اس تباہی کے لپیٹ میں آیا۔ لٹنت پھکنت کے ساتھ ہی ساتھ ہزاروں لاکھوں مسلمان مرتد ہوئے۔ العیاذ باللہ العظیم

یوں تو اس تحریک میں جو ناپاک تحریک تھی حصہ لینا۔ ہر متعصب، فسادی، فرقہ پرست غیرمسلم اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ پنڈتوں

کے وَرغلانے پر بڑے بڑے ہندو مہاجنوں، سَاہوکاروں اور بنیوں نے اس تحریک کے لیئے اپنی تجوریوں کے منھ کھول دیئے تھے۔ مگر جس انداز میں سرگرمی پنڈت کالی چرن، رَام چندرا۔ لالہ منشی رَام، شردھانند دھرم بھکشو لکھوئی، لالہ گوپی ناتھ امروہی نے دکھائی یہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔

شردھانند نے تو ایسی تیزی کا مظاہرہ کیا کہ خود دیانند اس سے پیچھے رَہ گیا۔ اس نے اس تحریک کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اور اس کے پیچھے اتنی مستعدی سے پڑا کہ شردھانند اور شدھی تحریک ایک وجود کے دونام ہو کر رَہ گئے۔

یہ شخص مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ تحریک ترکِ موالات (جو دَراصل ہندوؤں کی تحریک تھی) اس میں مسلمانوں کے سَاتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ جَامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر محمد علی جوہر کے سَاتھ ترکِ موالات کی حمایت میں زوردَار تقریر کی۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کی مصنوعی ہمدردی کا چولہ اتار کر پھینکا اور کُلّ شَیٍٔ یرجع اِلیٰ اَصلِہٖ۔ کے مطابق اپنی اصلیت پر آگیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب یہ کھل کر سَامنے آیا تو اس کے روپ کے یہ خدوخال ملاحظہ ہوں:۔

۱ ۔ شدھی تحریک کا اصل رُوحِ رَواں جس کا مقصد ہندوستانی نسل کے مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔

۲ ۔ تحریک سنگٹھن میں نمایاں حصّہ لیا جس کا مقصد ہندوؤں سکھوں اور بودھوں کے تعاون سے ہندوستان سے مسلمانو

کو نکال کر عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنا تھا۔

۳ ۔ دھلی سے اخبار "تیج" نکالا جس میں ایسے مضامین شائع کیے جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملے کیے۔ (اور تیج ویکلی دہلی کا آج بھی یہی دستور ہے)

۴ ۔ اس کے بیٹے نے ہندی زبان میں ایک اخبار "ارجن" نکالا جس کا مقصد سلاطین اسلام کے کردار کو غلط رنگ میں پیش کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا۔

۵ ۔ اس کے ایما پر ایک اخبار "گرو گھنٹال" جاری کیا گیا جس کا مقصد وحید مسلمانوں کی مقدس ہستیوں پر ناپاک حملے کرنا تھا۔

۶ ۔ اس کے ایک چیلے نے جڑبت نامی ایک کتاب لکھی جس میں پیغمبر اسلام و دیگر انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سخت توہین کی گئی۔

۷ ۔ اس نے مغل شہزادیوں کے خلاف ڈرامہ اور ناول لکھنے کی ایک تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں کئی ناول اور ڈرامے منظر عام پر آئے۔

غرض وہ زندگی بھر اسلام اور مسلمان دشمنی کا سب سے بڑا علمبردار رہا۔ رات دن وہ اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہا۔ مسلمانوں کو ستانے میں وہ راحت محسوس کرتا۔ اس کی آئے دن نت نئی خباثتوں اور دل آزاریوں سے مسلمان تنگ آ گئے تھے۔ ان ہی سب بے ہودگیوں اور ہرزہ سرائیوں کی بنا پر دھلی کے ایک غیرتمند مسلمان قاضی عبدالرشید نے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء میں شردھانند کو قتل

کر کے جہنم رسید کیا اور خود نتیجتہً ۱۹۲۷ء میں جام شہادت نوش کیا ۔
(رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ) (بحوالہ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص۲۰۲ تا ۲۰۶)

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

وقت کی بیحد خطرناک شدھی تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اس تحریک میں مجموعی طور پر ساڑھے چار لاکھ مسلمان مرتد ہوئے ۔ لٹنت پھکنت فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کا تو کوئی ریکارڈ ہی نہیں ۔

اس خطرناک تحریک کو کچلنے اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے امت مرحومہ کو بچانے کے لیے سوادِ اعظم اہلسنت و جماعت کے علماء و مشائخ پیرانِ عظام دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی اور استقلال کے ساتھ اس طوفانِ بلا خیز کا رُخ موڑ کر امتِ مسلمہ کو ایک بڑی تباہی سے بچالیا ۔ اس خصوص میں جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی جماعتِ اشرفیہ حلقہ اشاعت الحق اور انجمن خدام الصوفیہ نے تاریخ ساز کردار ادا کیے ۔

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خان بریلوی ، مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مصطفےٰ رضا خاں صاحب ، حضرت مولانا پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری ، تاج العلماء حضرت مولانا محمد عمر نعیمی ، شیخ المشائخ حضرت پیر سید علی حسین اشرفی ، مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی ، حضرت مولانا مختار احمد صدیقی میرٹھی ،

حضرت مولانا ابو البرکات سید احمد صاحب، حضرت مولانا نثار احمد صاحب کانپوری، حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب، حضرت مولانا سید قطب الدین برہمچاری، مولانا غلام عبد القادر اشرفی، حضرت میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی وغیرہ نے حیران کن کارنامے انجام دیئے ان نفوس قدسیہ نے اس زبردست فتنے کو مکمل طور پر کچلنے کے لیئے اپنے آپ کو بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالا۔ ان بزرگوں نے اس کے مکمل استیصال کے لیئے ملک میں طوفانی دورے کئے سینکڑوں مبلغ میدان ارتداد میں اتار دیئے اور اپنے جیب خاص سے بیشمار روپے خرچ کر کے اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ فاضل مراد آبادی اور محدث علی پوری علیہما الرحمۃ نے تو آگرہ کو ایک طویل عرصے تک ہیڈ کوارٹر بنا کر متھرا، بھرت پور، گوبند گڈھ، جے پور کشن گڈھ اور اجمیر شریف کے اطراف و جوانب میں مسلسل دورے گئے اور مبلغین بھیجے، براہ راست اس فتنے کو کچلنے کے لیئے اور بھی متعدد طریقے اختیار کیئے گئے۔

۱۔ وید حکیم کا بھیس بدل کر ۲۔ معالج حیوانات کا بہروپ بھر کے۔ ۳۔ سادھوؤں کا روپ دھارن کر کے ۴۔ گویوں کا بھیس بدل کر۔ غرض جہاں جیسی ضرورت محسوس کی گئی۔ مسلمانوں کو بچانے کے لئے ویسا ہی حربہ استعمال کیا گیا۔

ان نفوس قدسیہ کی سرفروشی اور مجاہدانہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے چار لاکھ مرتدین کو پھر اسلام کا کلمہ نصیب ہوا۔ اور ڈیڑھ لاکھ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ بھیس بدل کر جو کوششیں ہوئیں اسکی

وجہ سے پچاس ہزار ہندو مسلمان ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد جو سند جاری کی جاتی اس کے چار حصے ہوتے ایک حصہ اس نومسلم کو دیا جاتا دوسرا حصہ صدر دفتر بھیجا جاتا۔ تیسرا حصہ ریکارڈ میں رکھا جاتا اور چوتھے پر نومسلم کی چوٹی کاٹ کر لگائی جاتی۔

اسلام کی اشاعت میں صرف یہ حصہ اہلسنت کا ہے (جن کے سرخیل قائد اور امام برصغیر کے مشہور عاشق رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی ہیں) جبکہ جمعیۃ العلمائی ملاؤں، وہابی ازم کے علمبرداروں، وقت کے شیخ الہندوں، شیخ الاسلاموں، امام الہندوں اور ان کی ذریات کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ روز اول ہی سے یہ ظالم توحید کا زبانی ٹھیکہ دار بانٹتے اور شرک و بدعت کے سیفے میں ایسے مبتلا ہیں کہ انھیں کچھ کرنے کی نہ کل کچھ فرصت تھی اور نہ آج۔ بنام اسلام سی آئی اے کے روپے نے زمین دوز تباہ کاری اسلام کا ایک طویل عرصہ تک سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ ان کے اکابر نے وطن اور ملت فروشی کے ذریعے انگریزوں سے ہاتھ ملالیا تھا۔ اور ان ظالموں نے چند غلاظت کے لوتھروں کی خاطر اندر ہی اندر فرقہ پرستوں سے پیٹھ ملالیا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ایسے تاریک ایام، ہوشربا ماحول اور ہلاکت خیز دور میں تاریخ کے اجزائے پریشاں میں ان پردہ نشینوں کا دور دور تک نام نہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کی فراوانی اور پریس و قلم کی توانائی کی بدولت ذرائع ابلاغ پر تنہا اجارہ داری نیز غلط بیہودہ اور لایعنی صحافت نے بزدلوں کو شیر دل، وطن فروشوں کو وطن پرست اور چڑھتے سورج کے پجاریوں کو مجاہدین صف شکن بنا دیا۔

ہے۔ اس افسوسناک جعلی اور بقلم خود تاریخ نے دین فروشوں کو سرفروش اور حالات کی ستم ظریفی نے ایمان کے ڈاکوؤں کو اسلام کا سب سے بڑا غازی مجاہد اور شہید بنا دیا ہے۔

ہائے رے گردش ایام کل تک وہ لوگ جو وطن فروشی اور ملت کی نیلامی کا سٹہ لگاتے تھے، آج وہی اسلام کے سب سے بڑے علمبردار اور وطن کے پاسبان کا بہروپ بھرے تاریخ پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔

اشاعتی اور صحافتی محاذ پر سواد اعظم اہلسنت وجماعت کی بے حسی، بے بسی، سستی، تن آسانی، باہمی قدر کی پیمائش، افسوسناک تغافل اور مجرمانہ سکوت نے آج وہ دن دکھایا ہے کہ اندھیرا اجالا بن گیا اور ہے اور رات کو دن کی جگہ مل گئی ہے۔ ہماری غفلت شعاریوں اور مجرمانہ کوتاہیوں کی وجہ سے تاریخ کے وہ کچھار جہاں صرف شیروں کی دہاڑیں سنائی دیتی تھیں۔ آج وہی زاغ وزغن کی کائیں کائیں اور گیدڑوں لومڑیوں کی کوکوا اور ہنکاہنواں سے بار سماعت بنے ہوئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن ٥

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

تحریک شدھی میں بری طرح سے ناکامی کے بعد فرقہ پرستوں امن دشمنوں اور متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کی دلآزاری کا باقاعدہ تحریری سلسلہ شروع کیا جس کی شہادت میں آریہ سماج کی ان کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ترکِ اسلام، تہذیب الاسلام، سیتارتھ پرکاش، آریہ تیر پریلی، آریہ مسافر جالندھر، آریہ مسافر میگزین وغیرہ وغیرہ۔

غیرت مند مسلمانوں نے بڑی اولوالعزمی اور سرفروشی کیساتھ ان گستاخانِ رسول کا محاسبہ کیا۔ چنانچہ بارگاہِ رسول کے مشہور گستاخ راجپال کو غازی علیم الدین نے اس کی دوکان میں دن دہاڑے نوکروں کی موجودگی میں گھس کر اس دشمنِ اسلام کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد عشقِ رسول میں مست ہو کر مسکراتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو چوم لیا۔ ۲۵ لاکھ مسلمانوں نے عقیدت و احترام کے آنسوؤں کے ساتھ انھیں سپردِ خاک کیا۔ ایسے عاشق کی نمازِ جنازہ کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے دیدہ ور نے سید محدث دیدار علی تلمیذِ رشید اعلیٰ حضرت بریلوی کو صحیح حقدار قرار دیا لیکن انسانی سیلاب کے اس ریلے میں حضرت اپنی تمامتر کوششوں کے باوجود جائے نماز تک نہیں پہونچ سکے۔ کافی انتظار کے بعد کسی دوسرے خوش نصیب کے حصے میں یہ سعادت آئی۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔

سر دھا ملعون کو دلی کے ایک غیرتمند نوجوان قاضی عبدالرحیم نے جہنم رسید کر کے اسکی مستقل اذیت رسانیوں اور دلآزاریوں سے مسلمانوں کو نجات دلائی۔

بھولا ناتھ خبیث کو امیر احمد اور عبداللہ نام کے نوجوانوں نے ٹھیک کیا۔

قصور کے پالا مل کو محمد صدیق نامی ایک نوجوان اور کراچی کے نتھو رام کو غازی عبدالقیوم نے کیفر کردار تک پہنچایا ع خدا رحمت کنداین عاشقانِ پاک طینت را

اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ سے راضی ہوئے ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کہ دبا ؤ گے

جلوۂ رنگین کی تمنّا

روایتی قصے کہانیوں کی طرح کرامہ بنت عمرو بن عبد المسیح بن قیس بن حارث بقیلہ کے حسن جہاں سوز کا شہرہ عراق کے مشہور شہر حیرہ کے مرغزاروں سے نکل کر عرب کے ریگزاروں تک پھیل چکا تھا۔

مہ وشوں، لالہ رخوں، سروقدوں، سیمیں تنوں، گل بدنوں میں اس کے نازو انداز، دلبری ودلربائی، دلکشی ورعنائی، حسن و ادا اور بانکپن کا آوازہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ؎

تم چاندنی ہو، پھول ہو نغمہ ہو شعر ہو
اللہ رے حسن ذوق میرے انتخاب کا

حسرت دید کے تماشے لئے دیوان گان کوچۂ یار اس گلی کا طواف کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ جلوہ بے تاب کی ایک جھلک ہی سہی! جلتی آنکھوں کے لئے کچھ تو سامان تسکین فراہم ہو ؎

تمہاری دید ہی مقصد رہا ہو جن نگاہوں کا
وہ چشم منتظر پتھرا گئیں کیا تم نہ آؤ گے

دلبری و دلربائی کے ساتھ خرام ناز کا محشر، جانے کتنے دلوں کو زیر و زبر کر جاتا۔ اداے جانانہ کے ساتھ لبہائے ناز کا تبسم۔ دلوں کے آنگن میں موسم گل کا سماں باندھ دیتا ؎

؎ وہ جب آئے گا تو اُس کی رفاقت کے لئے
موسمِ گل میرے آنگن میں اُتر آئے گا

اور جب کبھی نرگسِ مست نازِ حیا آلود انداز لیئے اپنے پلکوں کی چلمن کو نیچے سے اوپر کرتی تو مشتاقانِ دید کی آنکھوں میں امید کی جلنے کتنی شمعیں جلنے لگتیں ؎

نرگس ہے چشم، سرو ہے قد، گل عذار ہے
نامِ خدا وہ شوخ سراپا بہار ہے

سیدِ العرب والعجم آقائے کائنات فخر موجودات حضور رحمت عالم نور مجسم سرورِ عالم جنابِ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے حیات ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد۔ افضل البشر بعد الانبیا، حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالٰے عنہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی قیادت آپ کے ہاتھوں میں آئی۔

اپنی دو سالہ خلافت راشدہ کے زریں دور میں ایمانی جرأت اور بے پناہ عزیمت و استقامت کا جو عظیم الشان مظاہرہ آپ نے فرمایا عقل و تاریخ انسانی دونوں آج تک حیران ہیں۔ حالانکہ آپ اس وقت عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں عام طور پر انسان قویٰ مضمحل، اعضاء کمزور، اور قوتِ فیصلہ جواب دے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود آزمائش کی کڑی دھوپ میں جس سرخروئی و کامیابی کے ساتھ آپ نکلے یہ سرتا سر توفیقِ الٰہی و فیضانِ صحبتِ رسالت پناہی کی بے پایاں برکتیں تھیں ورنہ اتنے مراحل کو کامیابی کے ساتھ جھیل لیجانا

یہ عام انسانی بس کی بات نہیں تھی۔

ع اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں

سرکار اقدس صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے فوراً بعد انتہائی نازک صورت حال ہوا کے بدلے ہوئے رُخ اور حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بڑے بڑے شجاعانِ عرب کو پسینہ آرہا ہے حتیٰ کہ فاروق اعظم جیسے سخت کوش اور استقامت کی کوہِ پیکر شخصیت کا انداز فکر بدلا نظر آرہا تھا۔

ایسے عالم میں خدائے ذوالجلال نے اپنے ناتواں بندے ابوبکر کے سینے کو انتہائی مضبوط و ناقابل تسخیر چٹان بنا کر اس میں نورِ بصیرت، عزیمت و استقامت، شعور و آگہی بے مثل فہم و ادراک، صحیح۔ بروقت قوت فیصلہ کی توانائی ودیعت فرما کر ان کی ذات ستودہ صفات کو اسلام و مسلمانوں کا پناہ گاہ بنا دیا۔ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اسلام کی تحفظ و بقاء کی جو تاریخی جنگ حضرت ابوبکر صدیق نے لڑی ہے۔ اسلام کے پورے عسکری تاریخ میں اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں تھیں یہ مردوں کی شمشیریں

سرکار دو عالم کے جدائی کا یہ صدمہ عظیم کیا کم قیامت تھا کہ منافقین کی خاموش کوششوں سے نظروں کے سامنے جسد اطہر کی موجودگی ہی میں مہاجرین و انصار کا اقتدار کے حصول کے لیے باہم ایک دوسرے سے الجھ کر تلوار نکالنے کے قریب پہونچ جانا فاروق اعظم کے تعاون سے کمال دانائی کے ساتھ اس قیامت خیز ماحول میں اس پر بروقت قابو

پالینا۔ اس کے بعد فوراً ہی سرزمینِ عرب کا اپنے اندر سے سارے فتنوں کو بیک وقت زمین پر اگل دینا، یعنی جھوٹے مدعیان نبوت کا ظہور اور ان کی تباہ کاریاں منکرینِ زکوٰۃ اور ان کی فتنہ سامانیاں، قبائل کے قبائل کا اسلام سے پلٹ جانا، پھر ان مرتدین کی ہلاکت خیزیاں، اسلام و مسلمانوں سے تازہ تازہ زخم و مار کھائے ہوئے چھپے و کھلے ہوئے دشمنوں کا مشترکہ محاذ اور ان کی غارت گریاں، اور ان سب کا ایک ہی وقت میں اسلام کو مٹانے کی پیہم کوششوں کا ظہور اور ایسے عالم میں حضور پاک کی اتباع میں اسلام کی فوجی طاقت کو اسامہ بن زید بن حارثہ کی سپہ سالاری میں وطن سے دور ملک شام میں لڑنے کے لئے تمام وسوسوں، اندیشوں، مصلحتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھیج دینا۔ پھر اس فوج کی واپسی کا انتظار کئے بغیر اسلام کے اندرونی کافروں، منکروں ظالموں۔ دشمنوں سے اپنی فوجی قلت و تمامتر بے سروسامانی کے باوجود لڑائی کے ہر محاذ کو کھول دینا اسلام کی بقاء کی جنگ میں رہی سہی اسلام کی ساری توانائی کو داؤں پر لگا کر انھیں جنگ کی آگ میں جھونک دینا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر محاذ پر فتح و نصرت کا پرچم لہرانا یہ ایسے محیر العقول کارنامے ہیں جس پر تاریخ آج بھی انگشت بدنداں ہے ؎

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اندرونِ ملک عہدِ صدیقی کی سب سے خوفناک جنگ۔ جنگ یمامہ جو جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی جو اتنی خوفناک تھی

کہ اسلامی لشکر کو پے در پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں بالآخر اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولید نے اس لڑائی کا فیصلہ کیا۔ باطل کا کس بل نکلا بد نہاد مسیلمہ کذاب جہنم رسید ہوا۔ مسلمانوں کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ اس جنگ کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ شہید ہونے والوں میں صرف ستر حفاظ قرآن تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کی شہادت ہی تدوین قرآن کا باعث ہوئی اس جنگ کے انجام نے منکرین مانعین ظالمین، باغیوں اور تمام سرکشوں کے کس بل نکال دیئے۔ اب پھر جزیرۃ العرب میں کوئی طاقت نہیں رہ گئی جو اسلام سے آنکھیں ملا سکے۔ سارا عرب ایک بار نئے سرے سے پھر مطیع وفرماں بردار ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولید جنگ یمامہ سے جب فارغ ہو گئے تو خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق کا حکم نامہ پہونچا کہ اپنی فوج لے کر عراق کی محاذ پر روانہ ہو جاؤ جہاں پر پہلے ہی سے حضرت مثنی بن حارثہ شیبانی حضرت ابوبکر صدیق کی اجازت سے اپنے جیالوں کے ساتھ عراق کے اندر گھس کر ایران کی عظیم طاقت کو للکار چکے تھے اور مسلسل کئی محاذ پر ان سے اپنی بے پناہ جنگی قیادت کا لوہا منوا چکے تھے۔

خلیفۃ المسلمین کے حکم پر خالد بن ولید راستے کی ہر رکاوٹ پر قابو پاتے ہوئے راستے کی مختلف آبادیوں اور بستیوں کو اسلامی ریاست میں شامل کرتے ہوئے عراق کے بے حد اہم شہر حیرہ میں پہونچ کر اس کا محاصرہ کرلیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیرہ کو

کو فتح کر لیا ؎

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

حیرہ کے گرد متعدد قلعے بھی تھے جن کے قلعدار مختلف قبیلوں کے سردار تھے اور ہر قلعے میں عیسائی عربوں کی فوج تھی۔ حضرت خالد نے اپنے جانبازوں کو ان میں داخل کر کے ہر قلعے پر اپنا ایک ایک سردار مقرر فرمادیا۔

چنانچہ ضرار بن الازور نے قصر ابیض کا محاصرہ کیا جس میں ایاس بن قبیصہ طائی رہتا تھا۔ ضرار بن الخطاب نے قصر عدکیسین کا محاصرہ کیا جس کا والی عدی بن عدی المقتول تھا۔ ضرار بن مقرانمرنی نے قصر بنو مازن کا محاصرہ کیا۔ جس کا سربراہ ابن اکال تھا۔ اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے قصر ابن بقیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس کا مالک عمرو بن عبد المسیح بن قیس بن حارث بقیلہ تھا۔ یہ چاروں قلعے تھے تو اہلِ فارس ہی کی عملداری میں کہ اس وقت عراق ملک فارس ہی کے تحت تھا۔ مگر یہ اپنے حدود میں آزاد تھے جو نوشیرواں عادل کے جیتے جاگتے شاہکار تھے ؎

چوں نوشیرواں عدل کرد اختیار
کنوں نام نیکش ازو یادگار
سزد گر د بدورش چوں نازم چناں
کہ سید بدوران نوشیرواں

اور یہ ابن عبد المسیح کوئی معمولی آدمی نہیں تھا پورے عراق پر ایرانی

قابض ہو گئے مگر اس کے باپ دادا نے ان قلعوں کو بچائے رکھا عراق میں رہ کر وہ فارس کی نمائندگی تو نہیں کرتا تھا مگر وہ ایرانیوں کے محکوم بھی نہیں تھا۔ بقیہ یہ تینوں قلعے اسی کے زیر اثر تھے۔

بذات خود وہ غیر معمولی طور پر بہادر، جری، طباع، ذہین اور حاضر جواب تھا حضرت خالد بن ولید کی ہدایت کے مطابق ان تمام اسلامی سرداروں نے ان تمام لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے سختی کے ساتھ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی طرف سے جزیہ کا مطالبہ ہوا کہ اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو جزیہ دے کر ہماری اطاعت قبول کر لو۔ ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر ان لوگوں نے اسے بھی نہیں مانا۔ پھر مسلمانوں نے ان تمام لوگوں کو ایک دن کی مہلت دی کہ خوب غور کر لو۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ مجبور ہو کر مسلمانوں نے جنگ کا آغاز کر دیا۔

سب سے پہلے دشمن کو موقع دے کر ان پر حملہ کرنے والے ضرار بن الازور تھے۔ بے حد نڈر اور بہادر سرداران کے طوفانی حملوں نے بہت جلد عیسائیوں کو اپنی اوقات یاد دلا دی دیکھتے ہی دیکھتے قصر ابیض کو ضرار کے جیالوں نے اپنے پاؤں سے روند ڈالا۔

فوجی غیر فوجی پادری، راہب شہری سب امان کے لیئے چلانے لگے۔ قصر ابیض کا حشر دیکھ کر بقیہ لوگوں کے عقل و ہوش خود ہی ٹھکانے لگ گئے اور انھوں نے ہر حال میں صلح ہی کو اپنی سلامتی کے لیے ضروری سمجھا۔

چنانچہ تمام قلعے کے سرداروں اور معزز لوگوں کا ایک وفد عمرو بن عبدالمسیح کی قیادت میں حضرت خالد بن ولید کی خدمت میں صلح کی نیت سے حاضر ہوا۔

عمرو بن عبدالمسیح کافی طویل العمر تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت اس کی عمر دو سو سال تھی۔ حضرت خالد سے اس کی بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ اس قدر طویل العمری کے باوجود اس کی طباعی ذہانت، بے خوفی اور حاضر جوابی سے حضرت خالد متاثر بھی ہوئے اور ضرورت سے زیادہ شوخی پر جھنجھلائے بھی!

حضرت خالد نے اس سے پوچھا

تم کہاں سے آئے ہو؟

اپنے باپ کے پشت سے!

تم کہاں سے نکلے ہو؟

اپنی ماں کے پیٹ سے!

جھنجھلا کر:۔ ارے تم پر افسوس تم ہو کس چیز پر؟

ہم زمین پر ہیں!

تمہاری عمر کیا ہے؟

سیکڑوں سال!

اس طویل عرصے میں تم نے عجیب ترین بات کیا دیکھی؟

میں نے دمشق سے حیرہ تک مسلسل آبادیاں دیکھیں اور یہ دیکھا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کرتی ہے مگر روٹی کے سوا اسے کوئی توشہ نہیں دیا جاتا۔

تم کچھ عقل سے بھی کام لیتے ہو۔
کیوں نہیں! عقل سے بھی کام لیتا ہوں اور قید سے بھی!
میں تم سے سوالات کر رہا ہوں۔
اور میں آپ کو جواب دے رہا ہوں۔
اچھا یہ بتاؤ کہ تم صلح چاہتے ہو یا جنگ!
ہم صلح چاہتے ہیں۔
تو پھر ان قلعوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟
یہ قلعے ہم نے اس لئے بنائے ہیں کہ کوئی بے وقوف اگر آئے تو ہم اسے قید کریں اور اگر کوئی سمجھدار آئے تو اس سے بچ کر چلا جائے۔
اس گفتگو کے بعد حضرت خالد بن ولید نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو ہمارے تمہارے حقوق برابر ہو گئے۔ اور اگر یہ بات تمھیں پسند نہیں تو پھر تمھیں جزیہ دینا پڑے گا۔ اور اگر تم اس سے بھی انکار کرو گے تو یاد رکھو ہم تمہارے لیئے ایسی قوم لائے ہیں جو موت کو ایسے ہی محبوب رکھتی ہے جیسے تم شراب نوشی کو۔
ہم لوگ آپ سے لڑنا نہیں چاہتے ہیں۔
اس کے بعد ان لوگوں اور حضرت خالد سے صلح کے معاملات پر گفتگو شروع ہوئی اور معاملات صلح طے ہونے لگے کہ اسی درمیان ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی حضرت خالد بن ولید کے سامنے کھڑا ہوا۔
حضرت خالد نے اس سپاہی سے آمد کی غرض دریافت کی۔
اے سالار اعظم اللہ کی رحمتیں آپ پر ہوں میرا نام شویل ہے میں

ایک گذارش لے کر خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔
کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔
یہاں پر ہماری فتح مکمل ہو گئی ہے نا؟
بے شک! سارے معاملات طے ہو چکے ہیں اب صلحنامہ لکھا جانے والا ہے
تو پھر اے سالار اعظم شہزادی کرامہ ہمیں دے دی جائے۔
بڑی حیرت کے ساتھ حضرت خالد نے اس عام سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں بھائی! اس شہزادی کرامہ تمھیں کیوں دی جائے۔
اس لیے کہ میرے آقا و مولیٰ حضور رسول پاک صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مجھے بہت پہلے شہزادی کرامہ عطا فرما چکے ہیں۔
دیکھو میرے بھائی تم ایک بڑا دعویٰ کر رہے ہو کرامہ کوئی عام سی عورت نہیں ہے بلکہ حیرہ کی شہزادی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں تم ایک عام سپاہی ہو۔ کیا تم اپنے اس دعوی کا گواہ پیش کر سکتے ہو کہ واقعی اللہ کے رسول صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کرامہ کو تھیں عطا فرما دیا ہے؟
کیوں نہیں یا امیر المومنین! جس وقت میرے آقا نے یہ فرمایا تھا اس وقت میں اکیلا نہیں تھا اور لوگ بھی تھے۔ اور شاید اس میں سے کچھ لوگ یہاں ہوں بھی۔
تو جاؤ کم از کم دو گواہ ضرور پیش کرو۔ اگر تم نے گواہ پیش کر دیئے تو کرامہ تھیں دے دی جائے گی۔
تلاش کے بعد اسلامی فوج میں دو گواہ ایسے مل گئے جنھوں نے حضرت خالد بن ولید کے سامنے یہ گواہی دی کہ بے شک اللہ کے

مقدس رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حیرہ فتح کے بعد کرامہ بنت عبدالمسیح کے لئے شویل سے وعدہ فرمایا تھا۔

صورتِ واقعہ کی تفصیل میں جاتے ہوئے ان لوگوں نے بتایا کہ ایک دن ہم لوگ آقائے کائنات مصطفےٰ جانِ رحمت (ارواحنا واجسادنا فداہ) صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر تھے۔ اثنائے گفتگو ذکر چل پڑا اسلامی فتوحات کا باتوں باتوں میں فارس کی شہنشاہیت اور کسریٰ ایران کا ذکر نکل پڑا۔ ہم میں سے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان اگر حیرہ ہاتھ آجائے تو کسریٰ پکاری ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

مشہور مورخ ابن جریر طبری و بلاذری کے مطابق غیب کی خبریں دینے والے نبی نے ارشاد فرمایا عنقریب حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوجائے گا۔ پھر اسی محفل میں حیرہ کی اہمیت اس کے گردو نواح کی خوبصورتی وشادابی کا ذکر چھڑ گیا۔

عمرو بن عبدالمسیح وہاں کی مشہور شخصیت تھی اس کی ایک بیٹی کرامہ تھی۔ جو رعنائی شباب کی پیکر، صبح مسرت کے اُجالوں کی طرح روشن اور جس کی خوبصورتی کی داستان دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

شاید کہ میرے لب پہ پھر تیرا نام آیا
کیوں صحن تمنا میں بجنے لگی شہنائی

ان مقدس و بابرکت محفل میں یہ سادہ لوح دیہاتی بھی بیٹھا ہوا تھا اس نے جوں ہی سرکار سے حیرہ فتح ہونے کی خوشخبری سنی تو جھٹ

بھولپن سے کہنے لگا یا رسُول اللہ کیا حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جائے گا

بے شک حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوگا۔

یا رسول اللہ تو قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

ہاں قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

یا رسول اللہ تو عبدالمسیح کی بیٹی کرامہ ہمیں دیدی جائے سرکار مسکرانے لگے سہ

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

مسکراتے ہوئے فرمایا اچھا فتح کے بعد کرامہ تمھیں دیدی جائے گی۔

عمرو بن عبدالمسیح اسے اچھی طرح سے سن لو۔ رسول خدا کا وعدہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ تمھیں ہر حال میں اپنی بیٹی کرامہ کو اس شخص کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت خالد کے اس فیصلے نے اہل حیرہ کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ عبدالمسیح کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اسے شدید ذہنی جھٹکا لگا قریب تھا کہ وہ اسے اپنی اہانت سمجھتے ہوئے سختی سے انکار کر دیتے۔ مگر حضرت خالد کے مستحکم عزائم اور خوفناک سنجیدگی نے انھیں حواس باختہ کر دیا۔ کافی غور و خوض کے بعد بالآخر ابن عبدالمسیح نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے کہا ٹھیک ہے کرامہ آپ کی خدمت میں پہونچا دی جائے گی جوں ہی یہ خبر وحشت اثر شاہی محل میں پہونچی وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا

کہ شہزادی کرامہ ایک بدو عرب کو دی جائے۔ قریب تھا کہ ایک ہنگامہ دار وگیر برپا ہو جائے کہ شہزادی نے سمجھاتے ہوئے کہا میرے عظیم باپ نے میرے بارے میں بڑا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ میری طلب کرنے والا کوئی احمق ہی ہوگا شاید کسی سے اس نے میری جوانی کے تذکرے سن لیے ہوں گے اور اپنی فطری حماقت سے جوانی کو کوئی سدا بہار چیز سمجھ رہا ہوگا۔ اس نے میری جوانی و حسن کے قصے تو سُنے لیکن زمانہ نہیں دیکھا میرے جلوۂ حسن کی تشہیر کا زمانہ، میرے عالم شباب کا زمانہ تھا جب رگ و پے میں آتش سیال بجلیاں بھرے ہوئے تھا ؎

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

مجھے اس بدو کے پاس لے چلو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اپنے محل میں واپس آجاؤں گی۔ کنیزوں کے جلو میں شہزادی جوں ہی شویل کے پاس پہونچی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے حیرت کو جھٹکا اور بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس سادہ لوح عرب کے سامنے حسن و ادا دلکشی و دلآویزی اور رعنائی شباب کے پیکر مجسم کے بجائے کنیزوں کے جلو میں ایک اسّی سالہ باوقار ضعیفہ خاتون کھڑی تھی جس کے چہرے پہ جھریاں اور بال سفید ہو چکے تھے اور جس کے رخ زیبا کے نقوش اور باوقار سراپے پہ عہد رفتہ کی خوشگوار کہانیاں رقم تھیں ؎

ڈوبا ہوا ہے دل مرا یادوں کی جھیل میں
آنکھوں میں خواہشوں کی تھکن کا خمار ہے

میں کرامہ بنت عبد المسیح ہوں سُنا کہ تم نے ہماری طلب کی ہے تو آخر میں

اسّی سالہ بڑھیا تمھارے کس کام کی؟ کیا بہتر نہیں ہوگا کہ مجھ سے کوئی رقم لے کر مجھے آزاد کردو۔

بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے شویل نے کہا۔ کیوں نہیں!

لیکن رقم مقرر کرنے کا اختیار مجھے ہوگا۔

ہاں ہاں جتنا چاہو مقرر کرلو۔

تو سن تو میں اپنی ماں کی اولاد نہیں اگر تم سے ایک ہزار درہم سے کم لوں۔

کیا ایک ہزار درہم زیادہ نہیں۔

نہیں ہرگز نہیں اس سے ایک درہم بھی کم نہیں ہوگا۔

شہزادی کا اشارہ پاکر ایک کنیز محل سے بھاگ کر ایک ہزار درہم لاکر شویل کے آگے رکھ دیا۔ وہ سادہ لوح عرب جس نے اپنی زندگی میں ایک ہزار درہم نہیں دیکھا تھا۔ اتنے درہم اکٹھا دیکھ کر بڑا حیران اور ساتھ ہی بہت خوش بھی ہوا۔ اور خوشی خوشی شہزادی کو واپسی کی اجازت دی۔ شہزادی بیتے ہوئے دنوں کا تصوّر لئے ہوئے شاہی محل میں واپس ہوئی ؎

آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

شویل وہ ایک ہزار درہم لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہونچے اور اپنا کارنامہ بیان کرنے لگے۔ ارے بھائی میں تو پھنستے پھنستے بچ گیا وہ کمبخت جس کی خوبصورتی کی اتنی دھوم مچی ہوئی تھی وہ تو اسّی سالہ بڑھیا نکلی۔ میرے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا۔

لیکن وہ بڈھی بھی کیا یاد کرے گی میں نے پورے ایک ہزار درہم اس سے وصول کر کے تب چھوڑا ؎

اب کون کرے جلوۂ رنگین کی تمنا
تم سے کہیں حسیں تھا ترے خواب کا عالم

کیا صرف ایک ہزار درہم لے کر تم نے اسے چھوڑ دیا۔ ارے بدھو وہ شاہی خاندان کی عورت تھی اس سے چاہے جتنے ہزار درہم چاہتے لے لیتے لیکن تم زندگی بھر بدھو کے بدھو رہ گئے۔

اچھا تو ایک ہزار سے بھی زیادہ درہم ہوتا ہے؟ ہم کو تو یہی معلوم تھا کہ ایک ہزار سے زیادہ درہم ہی نہیں ہوتا

ع اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

بلاذری نیز ابن جریر طبری نے تاریخ طبری کے حصہ دوم میں کرامہ کے حوالگی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

علم غیب مصطفےٰ کے منکرین و مانعین کو اس عظیم واقعے سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ آخر وہ تاریخ کی ان جیسے صدہا حقیقتوں کو کب تک جھٹلاتے رہیں گے۔ اور بھری دوپہر میں سورج کی حقیقت سے انکار کی دھاندلی کب تک چلائیں گے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ



کفن چور

بنو انصار کا وہ گل رعنا نسوانی وقار اور جمال و دلکشی کا پیکر تمنا بن کر جب شباب کی ابتدائی دہلیز تک پہونچا تو جانے کتنی آنکھوں میں اُمید و اشتیاق کی تمنائیں مچلنے لگیں سے

ذہن میں انگڑائیاں لیتا ہے جب تیرا خیال
شاخ لب پر مرے کھلتے ہیں تبسم کے گلاب

حسن کی قوت تسخیر تو یوں ہی بڑی ظالم ہوتی ہے اور جب اس میں شرم و حیا اور غیرت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ دو آتشہ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی وقت و حالات کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو جاتی ہیں

ع خندۂ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے

اس کے پاکیزہ کردار اور مثالی حسن کا تذکرہ وفا کی خوشبو کی طرح خاندان عزیز و اقارب سے آگے نکل چکا تھا جس کی وجہ سے بہت سارے خوابوں اور خیالوں پر از خود اس کا قبضہ ہو چکا تھا سے

دل میں دھڑکن کی طرح آنکھ میں آنسو کی طرح
تم مرے پاس رہو پھول میں خوشبو کی طرح

مگر ابھی اس کا شبستانِ وجود بابل کے آنگن ہی کو مہکا رہا

تھا۔ اس رعنائی شباب کی چھٹکی چاندنی سے کسی اور کے در و بام منور نہ ہو سکے تھے البتہ دل کے بہت سے ویران دریچے اپنے صحن تمنا میں اس کے وجود کی خوشبو کے لئے شدت سے بے چین تھے سے

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیئے دل کو دھڑکتا دیکھوں

کاشانۂ محبت میں زلفوں کے بکھرنے کا موسم قریب آچکا تھا۔ فطرت کی حنابندیاں اپنی تیاریاں مکمل کر چکی تھیں۔ منشار تخلیق کی تکمیل میں کلی پھول بننا چاہ ہی رہی تھی کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسکی ہستی کے تار و پود کو بکھیر دیا بہت سارے وہ دل جو اس کے پاکیزہ تصور سے دھڑکتے تھے زخمی ہو کر لہو لہان ہو گئے سے

آنکھیں کھلیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کائنات کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے رواں دواں تھی۔ شب کی سیاہ زلفیں ابھی کمر تک نہیں پھیلی تھیں۔ کہ رات کے اسی سناٹے میں ایک سایہ محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک قبرستان میں داخل ہو گیا۔

تاریک رات کا پُرہول سناٹا سارے ماحول پر مسلط تھا۔ ایسے وحشت خیز سناٹے میں وہ شخص ہر خوف سے بے نیاز ہو کر یکے بعد دیگرے قبروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسا لگتا کہ اسے کسی خاص قبر کی تلاش ہو۔ یہاں تک کہ وہ ایک

تازہ قبر پر پہونچ کر رک گیا۔

ادھر ادھر دیکھ کر ایک بار نظریں دوڑا کر وہ قبر کی مٹی کو اِدھر اُدھر ہٹانے لگا جلد ہی قبر کے تختے کو الگ کر کے قبر کے اندر داخل ہو گیا۔ بڑی مشاقی کے ساتھ کفن کو میّت سے اتارا پھر قبر برابر کی اور چل دیا ؎

اس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا

ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس بے جان جسم کے بے حد پر کشش سراپے اور اس کے خدوخال کی دلآویزی کی تصوّر نے اس کے دل میں ہوس کے شیطان کو بیدار کیا۔ جذبۂ شہوانیہ کے زیر اثر وہ وہیں سے واپس ہوا۔ بڑی وحشت خیزی کے ساتھ نئے سرے سے قبر کھودی تختہ اٹھایا اور قبر میں اتر گیا۔

اس بار خلافِ معمول وہ قبر میں دیر تک رکا رہا۔ اور جب نکلا تو جیسے خوف و دہشت نے اس کے لہو کو نچوڑ لیا ہو۔ عالمِ وحشت میں جیسے تیسے قبر کی مٹی برابر کی پھر افتاں و خیزاں ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں کفن بھی نہیں تھا۔ آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں اسے کسی جائے پناہ کی ضرورت تھی اپنے درد کے درماں کے لئے وہ کس جا مسیحا تک پہونچنے کے لئے بے قرار تھا مگر اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے ؎

گیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اس کی
کوئی لکھتا بھی نہیں کوئی جلاتا بھی نہیں

خوش بختیوں کے اُجالے میں بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ ایک دن فاروقِ اعظم آقائے کائنات مصطفٰے جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر ہوئے۔

عمر : سببِ گریہ کیا ہے؟

یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ! دَرِ اقدس پر ایک نوجوان کھڑا رو رہا ہے اس کے گریہ و زاری آہ و فغاں اور تپِ سینہ سوزاں سے دل پھٹا جا رہا ہے۔ وہ اندر آنا تو چاہ رہا ہے مگر ہمت نہیں کر پا رہا ہے ؎

آتشِ تر دامنی نے دل کے کیا کیا کباب
خضر کی جاں ہو جلا دو ماہیانِ سوختہ

عمر : اسے اندر بلا لو !

نوجوان نے لرزتے کانپتے کاشانۂ نبوت میں قدم رکھا۔

اللہ کے بندے اس قدر گریہ و زاری کیوں۔

یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ! میں ایک سیہ کار بدکار اور بہت بڑا گنہ گار و مجرم ہوں اپنی گناہوں کی کثرت سے خوف زدہ ہوں کہ کیا خدائے ذوالجلال مجھ جیسے مجرم کو بھی بخشدیگا؟

؎ دِل عبث خوف سے پتہ سا اڑا جاتا ہے
پلّہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسہ تیرا

اے نوجوان کیا تم نے شرک یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود مان لیا ہے؟

نہیں یارسول اللہ ! (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم)

کیا تم نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہے ؟

ہرگز نہیں اے اللہ کے حبیب !

تو سُن لے اے نوجوان ! اگر تیرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں سارے پہاڑوں کے بھی برابر ہوں تو خدائے ذوالجلال اسے اپنے فضل و رحمت سے بخش دے گا ؎

بد سہی چور سہی مجرم و ناکارہ سہی
اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریما تیرا

یارسول اللہ میرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں اور سارے پہاڑوں سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا کرسی ؟

میرے گناہ کرسی سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا عرش الٰہی ؟

میرے گناہ ! یارسول اللہ

تیرے گناہ بڑے ہیں یا خدائے ذوالجلال ؟

نہیں نہیں اے میرے آقا خدائے ذوالجلال تو بہت عظیم ہے۔

بے شک جرم عظیم کو رب عظیم ہی معاف فرماتا ہے ؎

ایک میں کیا میرے عصیاں کی حقیقت کتنی
مجھ سے سو لاک کو کافی ہے اشارا تیرا

اے نوجوان اپنے گناہوں کو بیان کرو !

یارسول اللہ شرم و ندامت سے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پا رہا ہوں کہ سرکار کے حضور لب کشائی کر سکوں۔

کوئی بات نہیں تم کچھ تو بتاؤ

یارسول اللہ میں ایک کفن چور ہوں اور سات برس سے یہی میرا ذریعۂ معاش ہے۔ جوں ہی کوئی آدمی انتقال کرتا ہے تو دفن کے لیے ساتھ ہی میں جنازے کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ اس تازہ قبر کو اپنے نگاہوں میں رکھ لیتا ہوں اور پھر جب رات ہوتی ہے تو میں وہاں پہونچ کر قبر کھود کر میت کے جسم سے کفن اتار کر لے آتا ہوں جسے بیچ کر میں اپنی روزی روٹی حاصل کرتا ہوں۔

چند دنوں پیشتر انصار کی ایک لڑکی کا انتقال ہوا۔ روایت دیرینہ کے مطابق رات کے سناٹے میں اس کی قبر پر پہونچ گیا۔ بڑی احتیاط سے قبر کھودی تختہ علیحدہ کیا اور میت کی نعش سے کفن اتار لیا پھر قبر برابر کیا اور واپسی کے لئے چل پڑا۔

وہ لڑکی اپنی زندگی میں بڑی خوبصورت تھی واپسی میں اس کے برہنہ جسم کے تصور نے میرے اندر کے شیطان کو بیدار کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے اوپر ہوس کا شیطان مسلط ہو گیا۔ میں راستے ہی سے واپس ہوا۔ قبر کھودی اور اس کے اندر اتر کر اس نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش سے مباشرت کی۔ میں مباشرت سے فارغ ہو کر جوں ہی چلنے لگا۔ یارسول اللہ وہ مردہ لڑکی قبر میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور قہر و غضب کے عالم میں کہنے لگی۔ خدا تجھے غارت کرے ایک مردہ جسم کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی اور تو اس خدائے قہار و جبار کے غضب سے بھی نہیں ڈرا جو ہر مظلوم کو ظالم سے

اس کا حق دِلاتی ہے پہلے تو نے مجھے مُردوں کی جماعت میں ننگا کر کے شرمندہ کیا اور جب میں بارگاہ الٰہی میں پیش ہو چکی تھی تو ایسے عالم میں تو نے مجھے ناپاک کیا۔

اتنا سننا تھا کہ آتش غضب نے رخسار رحمت عالم کو سُرخ کر دیا اور عالم غضب میں فرمایا او بدبخت ہٹ جا نظروں کے سامنے سے۔ تو۔ تو نارِ جہنم کا مستحق ہے۔ ع

غضب سے اُن کے خدا بچائے جلالِ باری عتاب میں ہے

امید کی مدھم سی جو لو تھی وہ بھی بجھ گئی اب دنیا اس کی نگاہوں میں تاریک ہو گئی۔ اس کی آخری آس یاس میں بدل گئی۔ خوفِ آخرت اور غضبِ الٰہی سے لرزاں و ترساں تو پہلے ہی سے تھا۔ اب اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

بے قرار دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ الحاح و زاری آہ و فغاں اور توبہ و استغفار کرتا ہوا صحرا کی طرف نکل گیا۔ اور مسلسل چالیس دن تک روتا بلکتا اور توبہ و استغفار کرتا رہا۔ اکتالیسویں دن برستی ہوئی آنکھوں اور دلدوز آہوں کے ساتھ آسمان کی طرف منھ اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگا۔ اے محمدؐ ابراہیم اور آدم کے رب اگر تو نے میرے گناہ بخش دیے ہیں تو اس کی اطلاع اپنے پیارے محبوب صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو دیدے اور اگر نہیں بخشا ہے تو پھر آسمان سے ایک آگ بھیجدے جو میرے وجود کو جلا کر خاکستر کر دے تاکہ میں جہنم کی آگ سے بچ جاؤں۔ بالآخر اس کے پرخلوص توبہ و ندامت اور گریہ و زاری نے رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا

مکین سدرہ سید الملائکہ حضرت جبریل امین بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے یا رسول اللہ آپ کو آپ کا رب سلام پیش فرما رہا ہے اور ساتھ ہی دریافت فرما رہا ہے کہ اے محبوب مخلوق کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ آیا تو نے یا میں نے :

اے جبریل تمام مخلوق کو میرے پاک و بے نیاز رب نے پیدا فرمایا ہے اور رہی جملہ مخلوقات اپنے فضل و رحمت سے رزق بھی عطا فرماتا ہے۔ تو پھر یا رسول اللہ اس گنہ گار نوجوان کو بلا کر خوشخبری سنا دیں کہ اس کے رب نے اس کی خطا کو معاف کر دیا ہے اور اس کے توبہ کو قبول فرما لیا ہے ؎

ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

وھٰذا مستفاد من مکاشفۃ القلوب للامام الغزالی

اللہ اللہ اتنا بڑا مجرم بخش دیا گیا۔ تو ہم گنہ گاروں کو چاہئے کہ اللہ کی بارگاہِ رحمت میں سچے دل سے توبہ کریں اور اس کی بارگاہ سے مایوس نہ ہوں ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

جہانِ حیرت

بریلی کے جواب نے علمائے رامپور کو ایک نئی صورتِ حال سے دو چار کر دیا۔ سرآمد روزگار علماء میں فکر و تشویش کی ایک لہر تازہ دوڑ گئی۔

ریاستِ رامپور کے والی نواب کلب علی خاں کے استفتاء کا یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد مجددی نے جواب لکھا۔ جس کی تصدیق رامپور کے مشاہیر علماء نے فرمائی۔

بریلی میں خاتم المحققین حضرت مولانا نقی علی خاں کے علم و فضل کا شہرہ بلند تھا اس فتوئی پر آپ کے دستخط کے حصول کے لیے وہ بریلی بھیجا گیا۔ خلافِ اُمید بریلی کے تحقیقی جواب نے ان حضرات کے علم و تحقیق کی بساط ہی الٹ دی۔

دستی جواب لانے والے کو بُلایا گیا۔ یہ جواب جو تم بریلی سے لائے ہو یہ خود مولانا نقی علی خاں صاحب کا لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ کسی گمنام آدمی نے لکھا ہے۔ البتہ ان کی تصدیق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ آیا مولانا نے اس جواب کو یوں ہی سرسری نگاہ ڈال کر دستخط کیا تھا یا بہت غور سے پڑھا تھا پھر دستخط کیا؟

حضور والا انھوں نے اس فتوے کو دیکھا پھر جا کر دستخط کی اور مہر لگائی۔

صورتِ حال کی تفصیل بیان کرو؟

جب میں رامپور سے یہ لفافہ لے کر مولانا صاحب کی خدمت میں پہونچا اور انھیں پیش کیا تو آپ نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا کہ بازو کے کمرے میں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہیں انھیں کو لے جاکر دے دو جو کچھ لکھنا ہوگا لکھ دیں گے۔ آپ کی نشاندہی پر جب میں اس کمرے میں پہونچا تو وہاں کسی مولوی صاحب کو نہ پاکر پھر واپس مولانا صاحب کی خدمت میں پہونچا اور عرض کیا حضور عالی اس کمرے میں تو کوئی مولوی صاحب نہیں ہیں البتہ ایک صاحبزادے تشریف فرما ہیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ہاں ہاں بھائی وہی صاحبزادے ہی مولوی صاحب ہیں آج کل اس طرح کا کام وہی کرتے ہیں۔

چنانچہ آپ کی ھدایت کے مطابق میں نے جاکر یہ لفافہ انھیں پیش کیا انھوں نے اسے کھول کر ایک نظر دیکھا پھر کہنے لگے اگر آپ کو فوری جواب کی ضرورت ہے تو کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ آپ باہر چل کر اطمینان سے بیٹھئے میں آپ کو بلاؤں گا۔

کافی دیر بعد وہ کمرہ سے نکلے اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اسے مولانا نقی علی خاں کو پیش کیا۔ آپ نے کافی غور وخوض سے اسے ملاحظہ فرمایا اس کے بعد دستخط کر کے مہر لگائی۔ لفافے میں بند کر کے مجھے دیا میں نے ویسے ہی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہوں! تو گویا کہ ایک طرح سے یہ انھیں کا فتویٰ ہے۔

جواب لکھنے والے نے یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب قبلہ کی کوہ پیکر شخصیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بات کا بھی احساس نہیں کیا کہ ان کی حمایت و تصدیق میں سرآمد علماء کی بڑی تعداد میں

دستخطیں و مہریں ثبت ہیں۔

ارے بھائی کسی مسئلے میں علماء کا اختلاف یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ تحقیقاتِ علمیہ کا دروازہ نہ کل بند تھا اور نہ آج ہی بند ہے۔ اس میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے بعینہٖ یہ فتویٰ نواب تک پہونچنا چاہیے۔ آخر وہ بھی صاحبِ علم و فضل ہے خانوادۂ خیرآبادی سے نسبتِ تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ دونوں فتوؤں میں جو واضح فرق ہے اسے وہ بھی تو محسوس کرے گا۔ ان میں کے ایک سنجیدہ عالم نے مشورہ دیا۔ چنانچہ کافی تامل اور غور و فکر کے بعد استفتاء اور دونوں جوابوں کو نواب کے حضور پیش کر دیا گیا۔

نواب صاحب نے بڑے غور سے پہلے مولانا مجددی صاحب کے جواب کو ملاحظہ فرمایا۔ ساتھ ہی معاصر علمائے رامپور کے تصدیقات پر بھی نظر ڈالی اور ایک آسودہ سانس لی۔

مگر جب اس نے بریلی کا جواب پڑھنا شروع کیا تو اس کے پیشانی پر بل پڑنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں جواب پڑھتا گیا حیرت و استعجاب بڑھتا گیا اور جب پورا جواب پڑھ چکا تو حیرت نے اضطراب کی شکل اختیار کر لی۔ فوراً خادم خاص کو آواز دی مولانا ارشاد احمد صاحب کو سلام پیش کرو اور تشریف آوری کے لیے عرض کرو۔

طبیبِ عشق سے پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا واجب ہے تجھکو صورتِ یوسف کا دم کرنا

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ نواب صاحب! بندے کو آپ نے یاد فرمایا ہے؟

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ خوش آمدید مرحبًا اھلاً وسہلاً ۔ زہے نصیب ۔ تشریف آوری کی زحمت کے لیئے معذرت خواہ ہوں ۔
کوئی بات نہیں یہ تو آپ کی محبّت ہے ۔ ویسے بندے کو یاد فرمائی کی زحمت کیوں فرمائی گئی ؟
بات کچھ عجیب سی ہوگئی ہے کہتے ہوئے بھی جھجھک محسوس ہوتی ہے ۔
بے تکلف ارشاد فرمائیں ہم جیسے درویشوں کے لئے اتنا تکلف کیوں ؟
بات کچھ یوں ہے کہ چند دن پہلے میری طرف سے آنجناب کے خدمت میں ایک استفتاء ارسال کیا گیا تھا جس کا آپ نے جواب بھی مرحمت فرمایا ساتھ ہی جلیل القدر علمائے رامپور کی تصدیقات سے وہ فتوی مزین بھی تھا ۔ مزید تصدیق کے لیے میری خواہش کے مطابق اسے بریلی بھی بھیجا گیا ۔ استفتاء ان کی بلند پایہ شخصیت کی اہمیت کے پیش نظر ایسا کیا گیا کہ ان کی جلالت علمی ایک امر مسلم ہے ۔
بے شک مولانا نقی علی خاں ایک بے پناہ علمی شخصیت کے حامل عالم باعمل اور ایک سچے عاشق رسول بزرگ ہیں ہندوستان میں ابھی ان جیسے بزرگوں کا دم بہت غنیمت ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلاف کے سچے یادگار ہیں ۔
لیکن حضور والا ! وہاں کے جواب نے تو ایک نئی صورت حال سے دوچار کر دیا ہے ۔ خود ہی ملاحظہ فرمالیں ۔ یہ کہہ کر استفتاء مع جوابات

سامنے رکھدیا۔ استفتا، اور بریلی کے جواب کو حضرت مولانا نے بڑی گہری نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

پھر ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے فرمایا قبلہ نواب صاحب فتویٰ وہی صحیح ہے جو بریلی سے لکھ کر آیا ہے۔

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بڑی حیرت ہو رہی ہے کہیں کسر نفس سے تو نہیں کام لے رہے ہیں آپ؟

یہ کسر نفس نہیں بلکہ فراخدلی کے ساتھ اظہار حقیقت ہے فتویٰ نویسی مولوی احمد رضا خاں کے نام سے کان آشنا تو نہیں لیکن انکی بلند پایہ تحقیقات علمی سے انکار ممکن نہیں اس پر مستزاد مولانا نقی علی خاں سلمہٗ کی تصدیق نے اس تحقیق کو اعتبار کی اعلیٰ ترین سند عطا فرمادی ہے۔

لیکن حضور کے جلالت علمی کا آفتاب بھی تو اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس کے بارگاہ فضل وکمال سے لوگ اپنی تحقیقات کو اعتبار کی سند سے مزین کریں۔ جس کی علمی عظمتوں شکوہوں کے سامنے جانے کتنی گردنیں خم ہوں کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اس کی علمی تحقیق ایک گمنام مولوی کے تحقیق سے فروتر ہو۔

قبلہ نواب صاحب! آپ تو ذی علم آدمی ہیں۔ مستزاد برآں خیرآبادی خانوادے سے نسبت تلمذ کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔ کیا الانسان مرکب من الخطاء والنسیان ایک ٹھوس حقیقت نہیں میں بھی ایک انسان ہوں خطا چوک مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔

چلئے آپ سے چوک ہو گئی ..... مگر آپ کے جواب پر تصدیق کے لئے جو یہ نامی گرامی علمائے کرام کے ناموں کی ایک طویل فہرست مع مواہیر ثبت ہے۔ کیا ان سب سے اجتماعی غلطیاں سرزد ہوئیں ؟

ان حضرات نے دستخط کرتے وقت اپنی تحقیقات و معلومات سے زیادہ اعتماد میری ذات پر کیا کہ ارشاد احمد مجددی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ صحیح ہی ہو گا۔ ان سے اجتماعی خطا میری علمی قدر و شہرت پر اعتبار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ جبکہ مولوی احمد رضا سلمہٗ نے میری شہرت سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد کیا۔ جو کسی بھی ذمہ دار شخصیت کے لئے ناگزیر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے اعتبار کے اس پرانے پیمانے کو توڑ کر تحقیق کی لاج رکھ لی۔ اور اس جرأت اظہار ضرورت پر مولانا نقی علی خاں جیسی بزرگ شخصیت نے حوصلہ افزائی کی مہر لگا دی اور یہی ہونا چاہیے۔

تمھیں نے جرأت اظہار شوق دی ورنہ
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

حضور والا اس حقیقت پسندانہ جرأت اظہار پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں اپنی کسی چوک کو اور وہ بھی اپنے چھوٹوں کے مقابلے میں بطیب خاطر قبول کر لینا یہ آپ کی بڑائی ہے۔ آپ کی قدر اور احترام میرے دل میں اور بڑھ گیا۔ مولیٰ عزوجل آپ کے سایۂ عاطفت کو تادیر ہم پر سلامت رکھے۔

آپ کے اس فراخدلانہ انتہائی جرأت مندانہ اظہار حقیقت اور ایک گمنام آدمی کے بلند پایہ تحقیقات کو ایسے انداز میں سند

اعتبار نے میری آتش شوق کو ہوا دیدی ہے کہ ایسی علمی شخصیتوں سے تعارف اور ان کا نیاز حاصل کیا جائے۔

وحشتیں بڑھتی گئیں میرا جنوں تازہ ہوا
اب کسی کی یاد کی شدت کا اندازہ ہوا

بے حد قریبی رشتے دار کے ذریعہ جب نواب رامپور کا دعوت نامہ مولانا احمد رضا خاں کو ملا تو آپ والد محترم کی اجازت سے رامپور تشریف لائے۔ نواب نے والہانہ پذیرائی کی کمسنی اور چہرۂ زیبا پر آغاز سبزہ دیکھ کر تحیر خیز مسرت کے ساتھ مرحبا کہا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ اپنی پلنگڑی پر بٹھالیا۔ لوازمات میزبانی کے بعد نواب صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ! اس کمسنی کے عالم میں فقہ میں درک و دینیات میں جو کمال آپ نے حاصل کرلیا۔ اس پر وقت کی بے کراں علمی شخصیتوں نے آپ کی تحقیقات علمیہ کو اعتبار کی سند بھی مرحمت فرمادی ہے۔ یہ بہت بڑی بات اور تاریخی نوادرات سے ہے۔

میری خواہش ہے کہ جہاں آپ نے دینیات میں اس درجہ کمال حاصل کرلیا ہے وہیں معقولات میں بھی ایک انفرادیت قائم کریں۔ آپ کی خوش بختی سے مجاہد حریت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے فضل و کمال کے امین ان کی علمی جلالت کے شاہکار اعظم خیرآبادی خانوادے کے شمع فروزاں اور معقولات کے امام برحق حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی کی شمع حیات روشن ہے۔ آپ ان سے منطق وفلسفہ کی بلند پایہ کتابیں پڑھ لیں تاکہ دینیات کی طرح معقولات میں بھی آپ کی علمی جلالت کو عظمت و اعتبار کا سند مل جائے۔

ان کی ذات والاصفات سے نسبت تلمذ ہی ایک بڑا اعزاز ہے
ابھی یہ ذکر جمیل چل ہی رہا تھا کہ حسن اتفاق سے اس مجلس خاص میں
حضرت مولانا عبدالحق[1] صاحب تشریف لے آئے۔

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے ترے ہونٹ جن سے مہک اٹھے
میرے دشت باغ میں دور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے

زہے نصیب! مرحبا! اھلاً وسھلاً بڑے موقع سے قدم رنجہ فرمایا آپ نے۔

---

[1] محقق جلیل، علامہ دہر، محقق عصر، امام الحکمۃ، شمس العلماء، تاج الحکماء حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی بن مجاہد حریت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دلی میں سررشتہ دار ریزیڈینٹ عوام رعایا میں ہر دلعزیز حکام و دربار شاہی میں معزز و با اقتدار تھے فرزند ارجمند کی ولادت پر تحائف و ہدایا کے انبار لگ کر لاکھوں روپے نذرانے میں پیش ہوا۔

ہوش سنبھالا تو باپ کے علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی کا دربار علمی کا نظارہ کیا۔ دلی اس وقت بلند پایہ علماء، مشائخ شعراء، ادباء کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ہر چہار جانب اصحاب فضل و کمال کے سطوت و جبروت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔ والد ماجد نے تربیت کے ساتھ ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ہاتھی و پالکی پر آتے جاتے وقت بھی درس دیتے اور پڑھاتے رہتے۔ سولہ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول و معقول سے فارغ التحصیل کر دیا۔ خود مولانا

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

یہ مولوی احمد رضا سلمہ ہیں مشہور بزرگ مولانا رضا علی خاں کے پوتے مولانا نقی علی خاں بریلوی کے بلند اقبال صاحبزادے جنھوں نے اس کمسنی ہی میں دینیات میں بڑا کمال حاصل کر لیا ہے اپنے وقت کے بزرگ ترین علما، اور یگانۂ روزگار شخصیتوں نے ان کی علمی جلالت کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کی بلند پایہ تحقیقات کو اعتبار کی سند سے نوازا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ انھیں معقولات کی اہم اور

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) کا آبائی وطن خیرآباد بھی علم وادب کا گہوارہ تھا شاہی دور میں کشنری رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اول میں شمار رہا ہے۔ خیرآباد و دہلی کی علمی صحبتوں نے کم عمری ہی میں مرتبۂ کمال کو پہونچا دیا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی جب حاشیہ قاضی مبارک لکھ رہے تھے کہ درمیان میں کسی ضرورت سے اٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے مولانا عبدالحق (جو ابھی زیر تعلیم تھے) کہیں سے پہونچ گئے۔ علامہ نے جہاں پر قلم روکا تھا وہیں سے آگے اسی بحث کو ایک صفحہ لکھ کر چلے گئے اس وقت آپ کی عمر صرف چودہ [۱۴] سال تھی حضرت علامہ کے دریافت کرنے پر جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور اسے بعینہٖ باقی رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں دہلی ہی میں تھے باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہونچ گر پیروی کی۔ جزیرۂ انڈمان چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ خیرآباد ہی رہے پھر نواب ٹونک کی دعوت پر ٹونک چلے گئے دو [۲] سال وہیں قیام فرمایا۔ فضل وکمال اور درس وتدریس کا شہرہ ملک و بیرون ملک تک پھیل چکا تھا طالبان شوق ہر چہار جانب سے کشاں کشاں پہونچ رہے تھے۔ علمی جلالت کا غلغلہ سن کر

(باقی اگلے صفحہ پر)

بڑی بڑی کتابیں پڑھا دیں تاکہ منقولات کے ساتھ ہی ساتھ معقولات میں بھی زبردست ملکہ حاصل ہوجائے اور اس میدان میں بھی انکی انفرادیت کا سکّہ دلوں پر بیٹھ جائے کہ

ع وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

مولانا عبدالحق خیرآبادی جن کی شکوہِ علمی اور تبحر کا غلغلہ برصغیر ہند سے نکل کر دور و دراز ممالک تک پھیل چکا تھا اور جس کا انھیں احساس بھی تھا۔ اسی احساسِ برتری کا نتیجہ تھا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ دنیا میں باکمال حکماء کی تعداد صرف ڈھائی ہے ایک والد مرحوم (یعنی علامہ فضل حق خیرآبادی) دوسرے بحرالعلوم فرنگی محلی مولانا عبدالعلی لکھنوی۔ اور نصف بندہ عبدالحق جزیرہ انڈمان

گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے خدمات حاصل کرلیں۔ کلکتہ کی ہوا ناموافق ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی کے بے حد اصرار پر رامپور تشریف لائے نواب نے شاگردی اختیار کی اور تعظیم و تکریم کا حق ادا کر دیا۔ انیس سال تک رامپور میں حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رہے۔ گراں قدر مشاہرے کے علاوہ نواب آئے دن بڑی بڑی رقمیں نذرانے میں پیش کرتا رہا۔ مگر مولانا کے شاہانہ داد و دہش کے لیے یہ سب ناکافی ہوتے۔ شہنشاہ امیر تیمور نے جو قدر افزائی علامہ سعدالدین تفتازانی کی کی۔ وہی عزت و توقیر نواب کلب علی خاں نے مولانا کی فرمائی۔ حضرت شاہ بخش اللہ تونسوی سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ آخر وقت میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مبذول

(باقی اگلے صفحہ پر)

(کالا پانی) میں ایام اسیری کے درمیان کسی نے مجاہد حریت علامہ فضلِ حق خیر آبادی سے پوچھا۔

حضور والا! اپنے پیچھے آپ نے ہندوستان میں عظیم یادگار کے طور پر کیا چھوڑ کے آئے۔ صرف دو چیزیں! حاشیہ قاضی مبارک اور عبد الحق۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنے عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔ اور ان کے کمالات علمی کے صحیح جانشین۔ بڑے بڑے رؤسا، امراء، نوابین، راجے مہاراجے آپ کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے اور انھیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں۔

بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا
نہ ہو جائے کوئی خاطر کبیدہ

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) فرمائی۔ خیر آباد ہی میں ۲۳ رشوال المکرم ۱۳۱۶ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا احاطہ مخدوم شیخ سعد میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور استاذ الاساتذہ ملا اعلم سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے ــــ مولانا کی رحلت سے ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی ملک و بیرون ملک کے اسلامی مدارس پر سوگوار سناٹا چھا گیا۔ خود خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی نے اپنے مدرسہ اظہریہ میں ایک ہفتہ تعطیل رکھی اور سوگ منایا ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل و جرائد مقالات، قصیدے اور تعزیت نامے لکھے۔ عالمِ اسلام نے آپ کی وصال کو پورے طور پر محسوس کیا ہر طبقے میں آپ کی رحلت پر ایک جاں گسل خموشی طاری ہو گئی۔ استاذِ وقت امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی ؎

شمس العلماء ظلمت دہر   چوں تیر ز ابر تیرہ بر جست
بر لوح مزار امیر بنویس   آرام گہِ امام وقت است ۱۳۱۶

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایسی صاحب کرامت وعظمت ہستی جسے اپنے شخصی عظمتوں، رفعتوں، بلندیوں وعلمی وجاہتوں کا نہ صرف احساس بلکہ اس کا پندار بھی ہو۔ بھلا وہ ایک کمسن و نوخیز نوجوان (کہ جس کی مَسیں ابھی بھیگ ہی رہی ہوں اور چہرے کا سبزہ شباب کی ابتدائی دہلیز کی طرف اشارہ کر رہا ہو) کو خاطر میں لا سکتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) موصوف اکابر و اسلاف کے نادر یادگار تھے ایک ذات واحد میں کمالات غریبہ واوصاف عجیبہ کا جمع ہونا مولانا کی ذات بابرکات کا خاصہ تھا بقول لسان الملک ریاض خیرآبادی...... زمانہ تو صورت ظاہری کا معاوضہ ہی نہیں ادا کر سکتا۔ وہ نورانی چہرہ وہ خندہ روئی وہ زندہ دلی وہ سراپا علم وہ رعب کمال وہ شان ادب وہ فضل وجلال۔ ع تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

وقار و تمکنت جرأت اظہار استغناء، نازک مزاجی نوابانہ طمطراق، نفاست، نزاکت، دریا دلی سیرچشمی، حق گوئی، صداقت شعاری یہ سب آپ کی خصوصیات سے ہیں.... دور دراز سے تاجر آپ کی داد و دہش قدر دانی، منھ مانگی قیمت کا شہرہ سن کر آپ کے پاس آتے۔ اگر کبھی کسی نے اپنی چیز کی قیمت وہی مانگی جس حساب سے عام لوگوں کو دیتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ تو فوراً اسے واپس کر دیتے آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر کسی دریا دل با اختیار حکمراں کے دربار کا نقشہ سامنے آجاتا تھا خود ہی فرماتے تھے تاجر ہمارا نام سنکر آتے ہیں منھ مانگا دام پائیں تو کاہے کو کوئی آئے لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کے مانند ایک بوریہ نشین ملائے مکتبی بھی ایسا ہے جو امراء کی طرح دل رکھتا ہے ؎

جن کے دم سے تھی شہر کی رونق ۔ کیا ہوئے وہ کدھر گئے چہرے

(اگلا صفحہ دیکھئے)

نواب کی دلدہی کے لیئے ایک نگہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑے سرسری طور پر انتہائی خشک لہجے میں دریافت فرمایا۔ میاں صاحبزادے اب تک منطق میں تم نے کون سی کتاب پڑھی ہے

حضور والا : قاضی مبارک[1]

(حیرت و استعجاب کے ساتھ) کیوں صاحبزادے! کیا تم نے تہذیب[2] پڑھ لی ہے۔

حضور والا! کیا آپ کے یہاں قاضی مبارک کے بعد تہذیب پڑھائی جاتی ہے؟ اس حاضر جوابی نے بلند پیشانی پر سلوٹوں کو نمایاں کر دیا۔

(بقیہ آگے کا) اب ایسے لوگ کہاں جو اپنے علمی وجاہت عالمانہ طمطراق اور اپنی عزت نفس کے تحفظ کے لیے بڑی سی بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ آج علماء اور ذی علم علماء کی اکثریت نے بھی اپنے علمی پندار اور عالمانہ وجاہت و طمطراق کو اہلِ ثروت و دولت کے سامنے گروی رکھ دیا ہے اس دور میں اگر کہیں اُن کا عکس جمیل کسی حد تک ہی سہی نظر آجائے تو اسے بھی نوادرات ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔ اس دور میں شیخ الاساتذہ رئیس المحققین حضرت علامہ عبد الدین احمد قادری کے برادر خورد مکرم محترم محتشم ذوالمجد والفضل والجاہ والکرم شمس الحکماء سند المحققین حضرت علامہ حکیم محمد نعیم الدین صدیقی گورکھپوری میں ان کی علمی جلالت عالمانہ طمطراق، استغناء، جرأتِ اظہار، حق گوئی و صداقت شعاری ان کا علمی فضل و کمال، ان کی نفاست، نزاکت، فطری نازک مزاجی نوابانہ خو بو) بہت حد تک حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی کی جھلک ملتی ہے۔ (شعیب نعیمی)

---

[1] فن منطق کی اعلیٰ ترین کتاب۔ [2] فن منطق کی ابتدائی کتاب۔

صاحبزادے اس وقت آپ کا مشغلہ کیا ہے ؟
درس دیتا ہوں فتویٰ نویسی اور کتابیں لکھتا ہوں۔
کس موضوع پر لکھتے ہو ؟
" دینی ضرورت کے پیش نظر جس بھی موضوع پر لکھنا پڑ جائے ویسے فقہ میرے قلم کا جولانگاہ اسلام کے اندر در آئے ہوئے فتنوں کا استیصال میرا مشغلہ۔ فتنۂ عظیم وہابیت کا ردّ و قلع میرا خاص موضوع ہے "

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے ایک شاگرد مولانا ابو البرکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا عبد الحق خیر آبادی کے پاس ہی تھے۔ شہر کوتوال وارنٹ گرفتاری لے کر مولانا کے پاس پہونچا۔ جب آپ کو صورتِ حال معلوم ہوئی۔ تو مولانا نے قہر و جلال کے عالم میں کوتوال کی خوب خبر لی اور ساتھ نواب صاحب کو بھی خوب خوب نوازا کہ اکیلا کیوں چلا آیا اس کو بھی ساتھ لاتا تو مزہ آجاتا کہ ایک طالبِ علم پر یہ جرأت کیسے کی۔ کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہونچا اور سارے الفاظ دُہرا دیا۔ نواب صاحب مولانا کے ناز بردار و قدرداں تھے، اُلٹے کوتوال پر برس پڑے کہ مولانا نے میری توہین نہیں کی۔ بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے پاس گیا ہی کیوں۔ جو نواب کو بھی بُرا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا صرف تو ذمہ دار ہے۔ سچ ہے کہ۔ ع

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

(بقیہ آگے)

اوہ ! تو گویا تم بھی میرے خبطی بدایونی کی طرح ہو وہ بھی رات دن ان وہابیوں کے پیچھے ڈنڈے لئے پڑا رہتا ہے۔

حضور والا ! ردِّ وہابیت اگر خبط ہے تو اس کا باقاعدہ آغاز حضور کے والد گرامی قدر حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی ہی نے فرمایا ہے اور اسمٰعیل دہلوی کے رد میں ایک معرکۃ الآرا کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ تحریر فرمایا ہے جس میں انبیاء و مرسلین و اولیائے کاملین کی بارگاہ کے گستاخ و بے ادب کو بڑی ہی دو ٹوک انداز

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) شوق و عقیدت کا تقاضہ ہے کہ بس کہتے جائیے اور خوف طوالت دامن کھینچتا ہے کہ بس رک جائیے ورنہ ان کی زندگی بھر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے

ایک کنکر پھینک کر دیکھو ذرا تالاب میں
کس قدر موجیں اٹھیں گی سینۂ بیتاب میں

مولانا صاحب تصانیف بزرگ تھے آپ کی کتابیں داخل نصاب بھی ہیں۔ حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ غلام یحییٰ، حاشیہ حمد اللہ، حاشیہ میر زاہد، امور عامہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ، شرح سلاسل الکلام، جواہر غالیہ، رسالہ تحقیق تلازم، زبدۃ الحکمۃ وغیرہ وغیرہ مولانا کے تحریر کا یہ حال ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا بھی تسلسل بیان میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح نہیں

ؔ اشارا تاج الفحول محب الرسول حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی طرف ہے یہ آپ کے رفیق درس امام المعقولات مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔

محمد وارث جمال قادری

(بقیہ آگے)

میں کافر و مرتد و بے دین لکھا ہے۔ اور اسمٰعیل دہلوی کو قال المرید المرتد کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اس پر شرعی حکم نافذ کرتے ہوئے فرمایا۔ قایٔل ایں کلام لاطائل از روئے شرع مبین کافر و بے دین است ہرگز مومن و مسلم نیست وحکم او شرعًا قتل وتکفیر است۔ یعنی اس بیہودہ کلام کا قایٔل (اسماعیل دہلوی) شریعتِ غرّا کے نزدیک بے شک کافر و مرتد ہے ہرگز مومن و مسلمان نہیں اور اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اس کی گردن ماردی جائے اور اسے کافر قرار دیا جائے اور اس حکم شرعی کی تصدیق وتائید دہلی (جو اس وقت عالم میں انتخاب تھا) کے سترہ جلیل القدر علما، و مشائخ و محدثین زمانہ نے فرمائیں۔

ارے میاں صاحبزادے! ہمارے مقابلے میں تمھاری حاضر جوابی کا حال یہی رہا تو تم پڑھ چکے اور ہم پڑھا چکے۔

حضور والا! اتنی جسارت بجا بھی اس لئے کرسکا ہوں کہ مجھے شاگردی کا رشتہ ہی نہیں قائم کرنا ہے۔ کہ آپ کی درسگاہ کی حاضری میں بسا اوقات اپنے ان بزرگوں کے حق میں (جن کے لیے دل میں بیحد احترام ہے) ایسے جملے بھی سننا پڑے گا جس کو عام حالات میں ہم سن ہی نہیں سکتے ؎

تیرا کمال کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں
غزالِ شوق! کہاں کا اسیر ایسا تھا

(بقیہ آگے کا) نہیں بلکہ مسلسل کتاب ہے ؎

رچ بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا روپ
اب کیا کریں گے پھر کوئی شہکار دیکھ کر

یہ اس شخص کا آغازِ شباب تھا جس کا وجود بامسعود اصحابِ فضل و کمال کی تاریخ میں ایک جہانِ حیرت ثابت ہوا۔

کائناتِ ارضی کبھی اہلِ کمال سے خالی نہیں رہی ارسطو، افلاطون سقراط، فارابی، البیرونی، ابن سینا، ابن رشد، نیوٹن کپلر، گلیلو، غزالی، رومی، رازی، خیام وغیرہ وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور خود یہ لوگ انسانی تاریخ، تہذیبِ انسانی، انسانی تمدن، انسانی معاشرہ، سیاست مدن، فنون ارتقاء اور تہذیب الاخلاق پر بایں طور پر اثر انداز ہوئے کہ آج تک اُن کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں ؎

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں نہیں ہے

مگر چودھویں صدی ہجری کی ابتداء ہی میں برصغیر ہند سے تاریخ کی سطح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کر ابھرا جو علماء، فقہاء، عقلاء، حکماء، فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں اپنا بلند نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر کے گلِ سرسبد بنتا ہے۔

اس کی ذات ستودہ صفات سے علوم و حقائق کے اتنے سوتے پھوٹے جن سے فکر و آگہی کے ہر شعبے سیراب ہوئے۔ منقولات و معقولات میں ایسے حیرتناک کارنامے انجام دیئے کہ جن کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ علماء محققین فقہاء و محدثین کے لئے وہ کعبۂ آرزو تو تھے ہی۔ دورِ جدید کے دانشوروں، فلاسفیوں اور سائنس دانوں کے لیے ان کے پیکرِ علمی کا معقولاتی پہلو کم حیرتناک نہیں اپنی

تصنیفات میں نظریہ کشش ثقل، نظریہ اضافیت، نظریۂ حرکت زمین پر جب فاضلانہ بحث کرتے ہوئے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں تو وجدان پکار اٹھتا ہے کہ ؎

اک دانش نورانی اک دانش برہانی

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اور جب قدیم و جدید فلسفیوں کی طرف رخ کرتے ہوئے فلاسفیوں اور سائنسدانوں کی تحقیقات و تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ لے کر انکی علمی گرفتیں کرتے ہیں۔ مثلاً ابن سینا، شہرستانی، نظام معتزلہ نجم الدین علی ابن محمد القزوینی، شمس الدین محمد بن مبارک، میرک بخاری، امام غزالی عبدالرحمٰن بن احمد الایجی، سعدالدین بن مسعود محمد تفتازانی، نصیر الدین بن جعفر بن محمد طوسی، عبداللہ بن عمر بیضاوی، ملا محمد جون پوری، آئینرگ، نیوٹن، البرٹ، آئن اسٹائن وغیرہ وغیرہ۔ تو ایک منصف مزاج صاحب بصیرت انسان پکار اٹھتا ہے

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ع جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

ہندوستان کے مشہور شہر بریلی (روہیل کھنڈ) میں اللہ تعالیٰ نے اس رجل عظیم کو پیدا کیا کہ جس کے علمی کارنامے پر ارباب علم و دانش کی تاریخ حیران ہے۔ آپ نسباً پٹھان (یوسف زئی)، مذہباً سُنّی مسلکاً حنفی، مشرباً قادری تھے۔ شہر بریلی کے ایک خوش حال متمول اور علمی گھرانے میں ۱۰ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔

اے آمدنت باعث آبادیٔ ما
ذکر بود زمزمہ شادیٔ ما

آپ کا اسم گرامی محمد تاریخی نام المختار اور جدِ محترم مولانا رضا علی خان نے احمد رضا رکھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے آگے چل کر اپنے نام کے ساتھ بالالتزام عبدالمصطفےٰ لکھنا شروع کیا اس نسبتِ غلامی اور ادائے محبت کو تاحیات برقرار رکھا۔ شعر وسخن میں اپنا تخلص رضا اختیار کیا۔ ع

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

علوم عقلیہ ونقلیہ کے تحصیل کا یہ عالم کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں درس نظامی کی مشہور کتاب ہدایۃ النحو کی شرح لکھی۔ دس سال کی عمر میں مسلم الثبوت پر حاشیہ لکھا۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے والدِ گرامی حضرت مولانا نقی علی خاں صاحب قبلہ سے جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کرکے دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ اسی سال دارالافتاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ۲۲ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ آفتابِ شریعت وطریقت حضرت مولانا سید آلِ رسول مارہروی سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اور اسی وقت مرشدِ کامل نے اجازت وخلافت اور توجہ اتحادی سے سرفراز فرمایا۔

۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء والد ماجد کے ہمراہ حج بیت اللہ وزیارتِ نبوی کے لیے حاضر ہوئے یہی وہ مبارک سفر تھا جس میں آپ کے علم وفضل کا آفتاب پورے طور پر چمکا۔ عرب وعجم

جل وحرم مصر وحجاز بلاد مغرب بالخصوص حرمین طیبین کے بزرگ ترین علما، مشایخ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور احترام وعقیدت سے اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں پھر اجازت وخلافت اور سندوں کے حصول کا جلد نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اسی مبارک سفر میں علما مکہ معظمہ کی گذارش پر علم غیب رسول محترم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے تعلق سے ایک عظیم اور تاریخی کتاب بخاری عالم میں ساڑھے آٹھ گھنٹوں میں الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ" عالم وجود میں آئی جس نے علمائے حرمین طیبین کو انگشت بدنداں کر دیا۔

مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے علوم پر ایسے شہ پارے وگوہر ہائے آبدار سامنے آئے جس نے حرمین طیبین کے جلیل القدر علماء ومشایخ کو حیرت زدہ کردیا۔

علمائے حجاز نے جس قدر ومنزلت عقیدت ومحبت عزت و احترام کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ اس کی کوئی دوسری مثال اس عہد سے لے کر آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ جس کا اندازہ حسام الحرمین، اور الدولۃ المکیۃ پر لکھی جانے والی تقریظوں سے ہوتا ہے۔ اس سفر میں محافظ کتب خانہ حرم حضرت علامہ سید اسمٰعیل خلیل مکی نے آپ کو چودھویں صدی کے مجدد کا خطاب دیا۔

تفقہ فی الدین کا یہ عالم کہ تقریبًا بارہ ہزار صفحات پر مشتمل بارہ ضخیم جلدوں میں فتاویٰ رضویہ علمائے حرم کے استفسار پر

۱ الکفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدّ ۱۷ ھ (زبان عربی)
دو ضخیم جلدوں جد الممتار حاشیہ ردّ المحتار (زبان عربی) میں سواد اعظم

اہلِ سُنت وجماعت کو عطا فرما کر اپنی فقہی بصیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا جس پر فقیہانِ اسلام کو حیرت واستعجاب بھی ہے اور فرحت ومسرت بھی۔

عربی زبان میں آپ کے فتاویٰ کے صرف چند اوراق دیکھ کر مکہ شریف کے عالم جلیل مولانا سید اسمٰعیل خلیل بے ساختہ پکار اٹھے۔ واللہ اَقُوْلُ والحق اقول انہ لو رأٰھا ابو حنیفۃ النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ لاقرت عینہ ولجعل مؤلفھا من جملۃ الاحباب[1]۔ بخدا میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اس فتویٰ کو ملاحظہ فرماتے تو آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور صاحب فتویٰ اعلیٰحضرت امام احمد رضا کو اپنے شاگردوں میں شامل کر لیتے۔

یوں تو آپ کی پوری زندگی کارناموں سے عبارت ہے ہر لحظہ ہر آن کارنامے ہی کارنامے!

گویا ع ہر آن نیا طور نئی برق تجلّے

ہمہ دانی، ہمہ جہتی، مذہبی، سیاسی، علمی، فقہی اور مجددانہ کارنامے! جو اپنی وسعت، تنوع، مضامین کی بلندی، جودتِ فکر اور تعداد کی کثرت کے لحاظ سے ایک پوری اکیڈمی کے صدسالہ خدمات پر بھاری ہیں ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا اعلیٰحضرت امام احمد رضا نے تنہا انجام دے کر اپنی ہمہ گیر وہمہ صفت جامع وتابندہ شخصیت کے انمٹ نقوش چھوڑے وہ کون سا موضوع اور کون سا فن ہے؟ جو اس عبقری الشرق کے رواں وسیال قلم سے سیراب نہیں ہوا۔

---

[1] اس طرح کے متعدد تاثرات و واقعات کے لیے میری کتاب انوار کنز الایمان کا مطالعہ کریں۔ محمد وارث جمال قادری

تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت، فرائض، کلام، عقائد، تجوید، تصوف اذکار، اوفاق اخلاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، نحو، صرف، منطق ادب، زیجات، جبر ومقابلہ، جفر وتکسیر، مثلث ارثما طیقی، لوگارثم فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، حساب، نجوم، توقیت، غرض انسانی فضل وکمال کے پیکر مجسم نے جس سمت رُخ کر دیا۔ علوم وآگہی اور معارف وحقائق کے چشمے اُبلنے لگے۔ یہ اُن کی عظیم تر علمیت کی گیرائی وگہرائی ہی تو ہے کہ آج ایشیا سے لیکر یورپ اور افریقہ سے لے کر براعظم امریکہ تک جدید علمی دانشکدے آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں

برصغیر ہندو پاک میں پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جبل یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی افریقہ میں ویل یونیورسٹی، یورپ میں نیو کاسل یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی، لیڈن یونیورسٹی۔ امریکا میں برکلے یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی۔ یہ وہ جدید علمی دانش گاہیں ہیں۔ جہاں پر امام احمد رضا بریلوی کے منقولاتی ومعقولاتی پہلو پر کسی نہ کسی انداز میں کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

بے ہودہ گوئی وہرزہ سرائی وبدنام کرنے کے تمام قبیح ہتھکنڈوں کے باوجود آپ کے علم وفضل کا آفتاب پورے علمی تمازت کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور کائنات بھر کے دانشوروں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

جس قدر ہم نے مٹائے تیری یادوں کے نقوش
دلِ بے تاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

آپ کے تمام کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ترجمۂ قرآن پاک کنز الایمان ہے جسے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء محبت رسول میں ڈوب کر علم و ادب اور عشق و محبت کا شاہکار بنادیا۔ جس سے سوادِ اعظم اہلِ سُنت و جماعت کی آنکھیں ٹھنڈی جگر تازے اور جانیں سیراب ہوئیں ایمان کو نئی حلاوت اور زبان کو ادب کی نئی چاشنی ملی اور ساتھ ہی بصد نازِ اردوئے معلّٰی بھی جھوم اٹھی۔

ع خندۂ گل جنبشِ لب بوئے گل تقریر ہے

اس شہیدِ محبت اور کشتۂ تیغ نگاہِ مصطفٰے نے جس اندازِ محبت میں آنکھیں بند کرکے یہ ترجمۂ محبت! اہلِ محبت کو دیا ہے۔ وہ داستانِ محبت بھی بڑی عجیب[1] ہے۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

تراجم کے اس ہجوم میں جو فضیلت و برتری اور شانِ امتیاز ترجمۂ پاک کنز الایمان کو حاصل ہے وہ اہلِ علم، اہلِ ذوق، اہلِ ادب اہلِ محبت پر اظہر من الشمس ہے۔

کسی بھی زبان کے لب و لہجہ حسنِ بیان، اسالیب بلاغت کو جس حد تک ترجمہ میں سمویا جاسکتا ہے۔ عروج کے اس انتہاء پر

---

[1] تفصیل کیلئے سوانح اعلحضرت امام احمد رضا از علامہ بدر الدین احمد رضوی۔ یا راقم الحروف کی کتاب انوار کنز الایمان جو ۹ برس پہلے شائع ہو چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ محمد وارث جمال

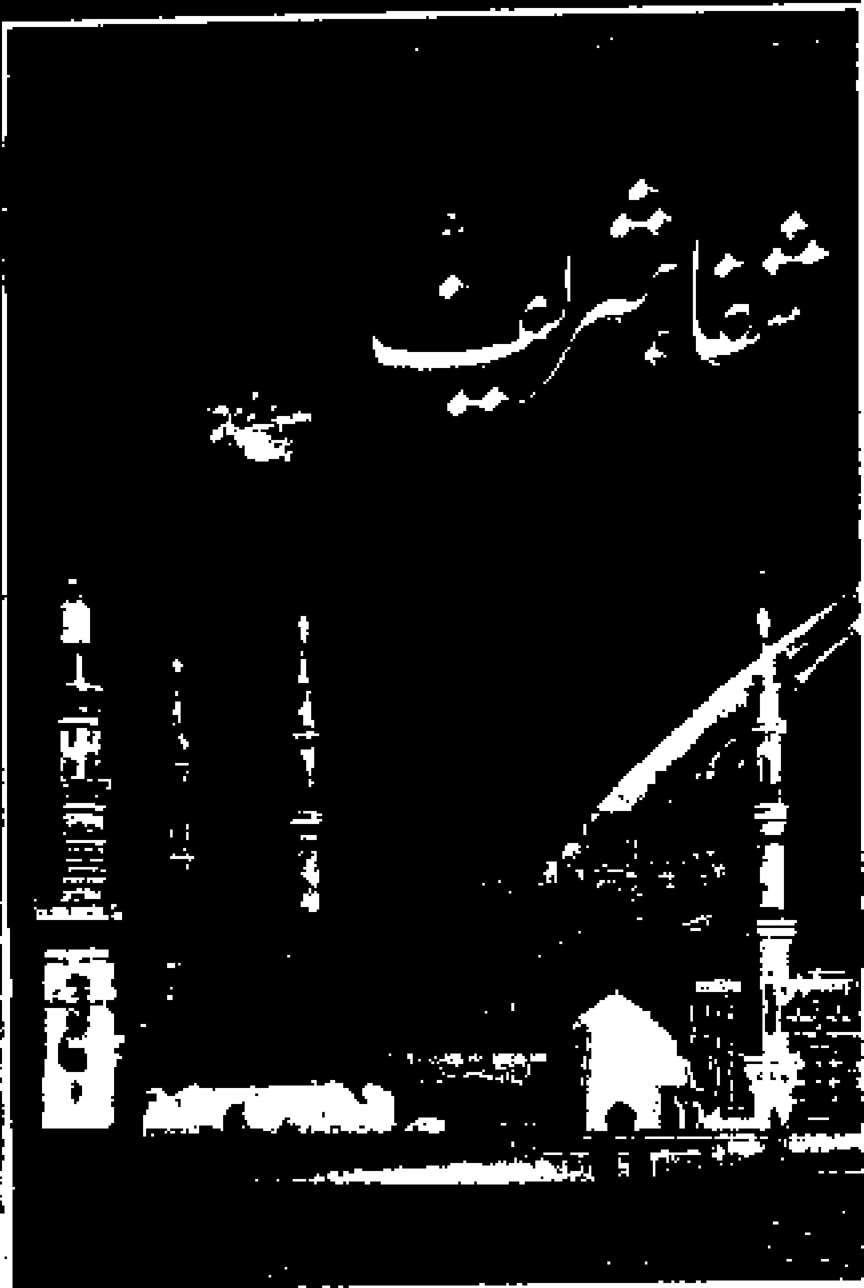
کنزالایمان کی انفرادیت اپنی مثال آپ ہے۔

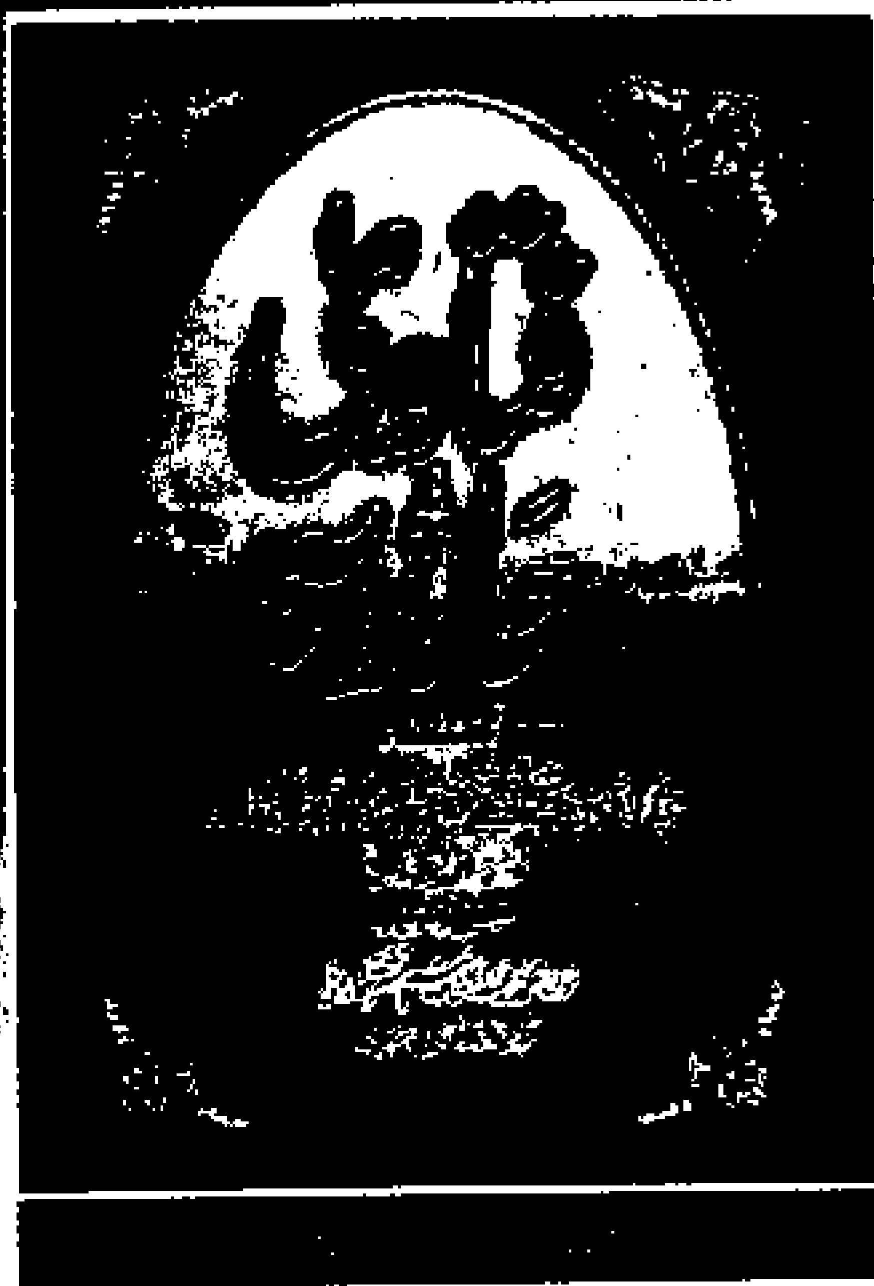
یوں تو کہنے کو اُردو زبان میں ترجمے بہت ہیں مگر ایسا ترجمۂ قرآن جو صرف قرآن سے کیا گیا ہو۔ جو میزانِ عشق پر نپا تلا ہو۔ جس کے ہر نازک مقام پر ادب و احتیاط، حزم و اتقاء، فکر و دانش، حرمت و تعظیم کے ساتھ ہی سرچشمۂ محبت ہی محبت ہو۔ وہ صرف مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی کا ترجمہ کردہ قرآن مجید (کنزالایمان) ہے۔

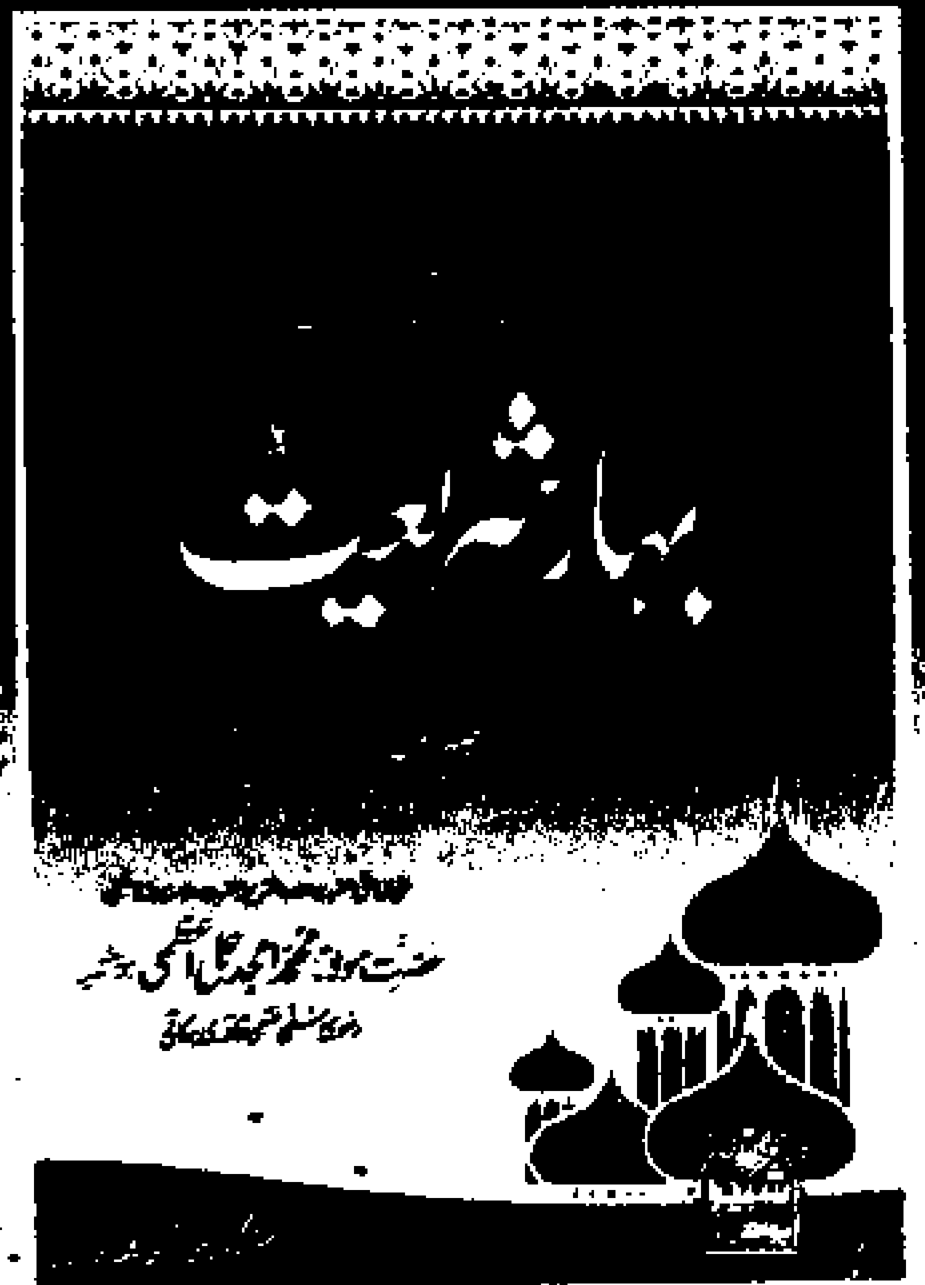
جس طرح قرآن کی فصاحت و بلاغت، لسانیات عرب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یوں ہی اردو تراجم میں کنزالایمان اردو ادب کا دُرِّ شاہوار ہے۔ اسّی برس کا طویل عرصہ اردو ادب کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ اس عرصے میں نمایاں ترقی کی طرف اردو ادب نے نہ صرف تیزی کا مظاہرہ بلکہ بلندی کی طرف جانے میں جست لگائی ہے بلیسویں صدی کے نصف آخر کو اُردو ترقی کا دورِ جدید کہا جا سکتا ہے مگر تقریباً اسّی برس کے بعد آج بھی ترجمۂ پاک کنزالایمان اردو زبان و ادب کا نمائندہ و ترجمان بنا ہوا ہے اس ترجمے کی معنوی خوبیاں تو الگ رہیں بلاغت زبان اور حسن ادب کا حال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کل بھی اُردو ادب کے ذوق نمود کی علامت بنا ہوا تھا اور آج بھی ہندوستانی ادب کدے کا قیمتی سرمایہ؛

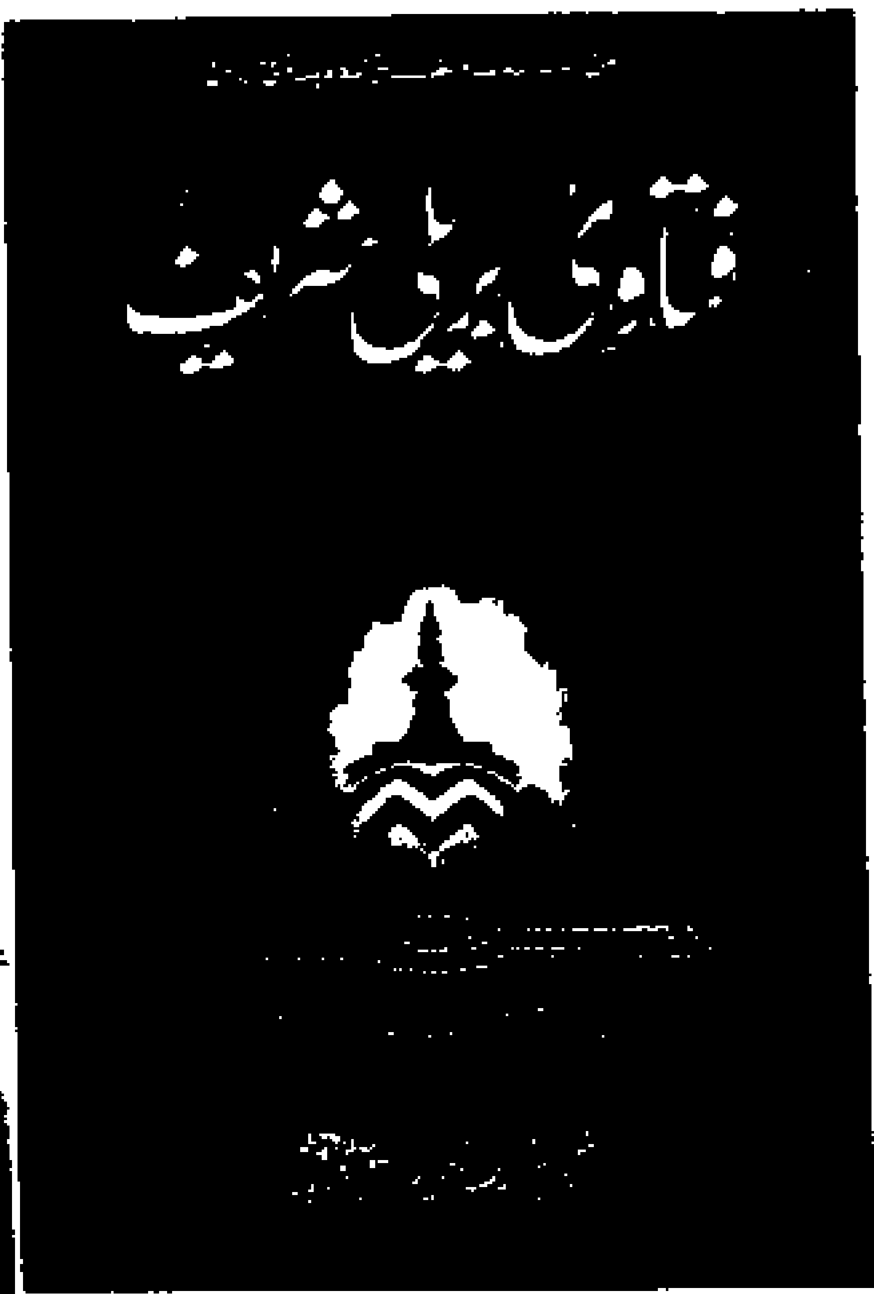
جسے فاضل بریلوی کی زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ اعلیٰحضرت کے خلیفۂ ارشد حضرت محدث اعظم ہند کا ترجمۂ پاک معارف القرآن اور حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی کے تراجم ماضی قریب میں منظر عام پر آ چکے ہیں جو کنزالایمان ہی کے عکس جمیل ہیں اور گوناگوں خوبیوں پر مشتمل۔ محمد وارث جمال

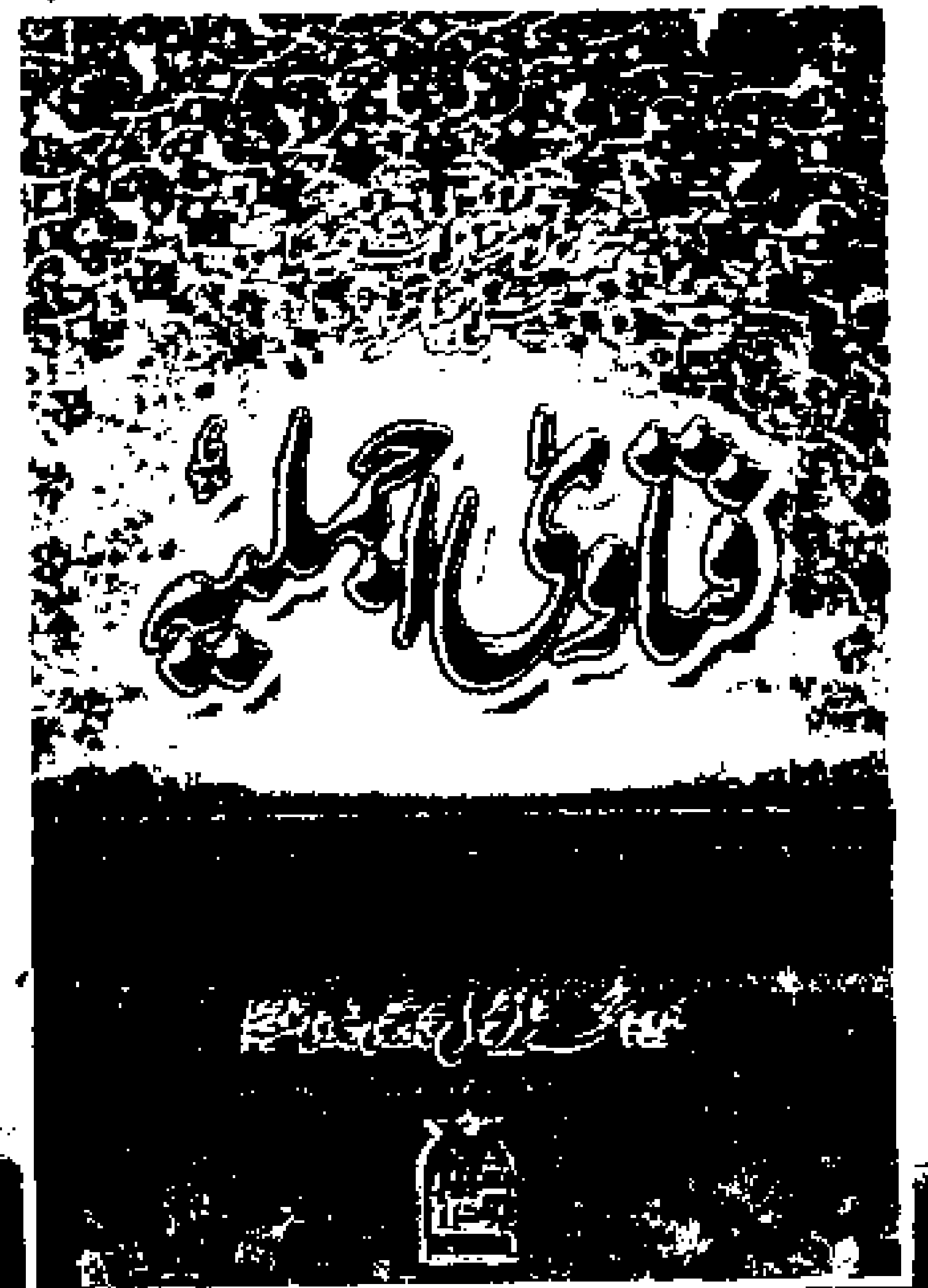

شفا شریف

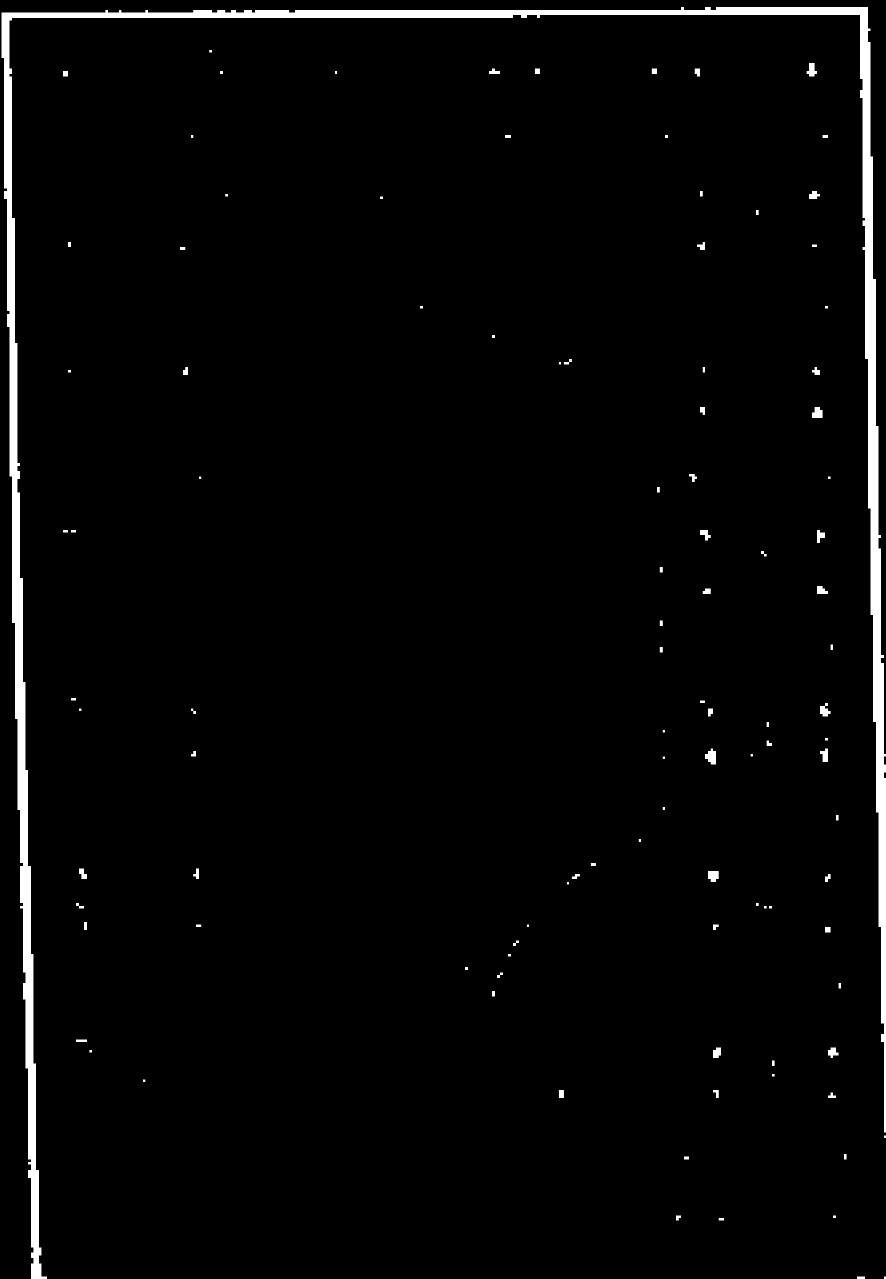


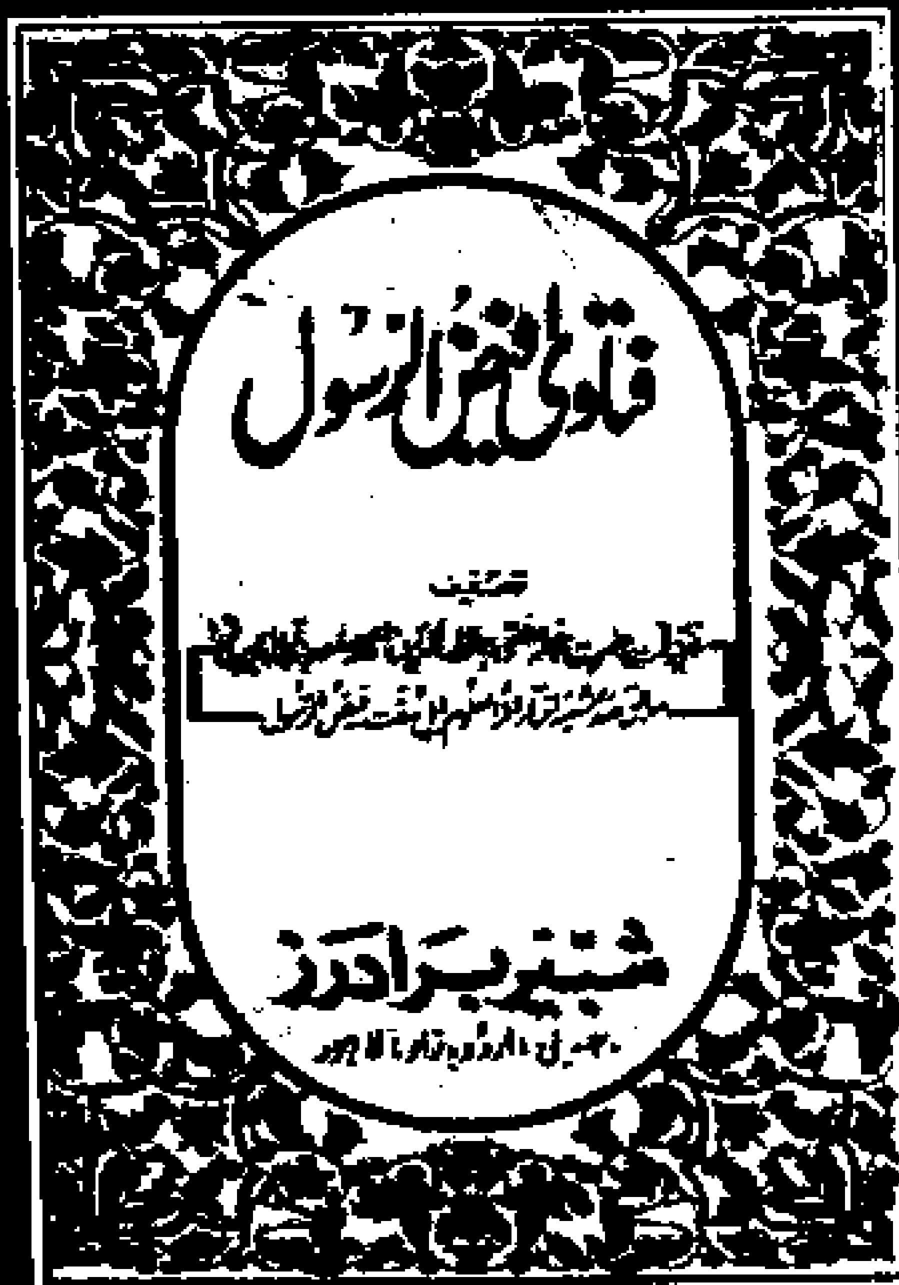

بہار شریعت

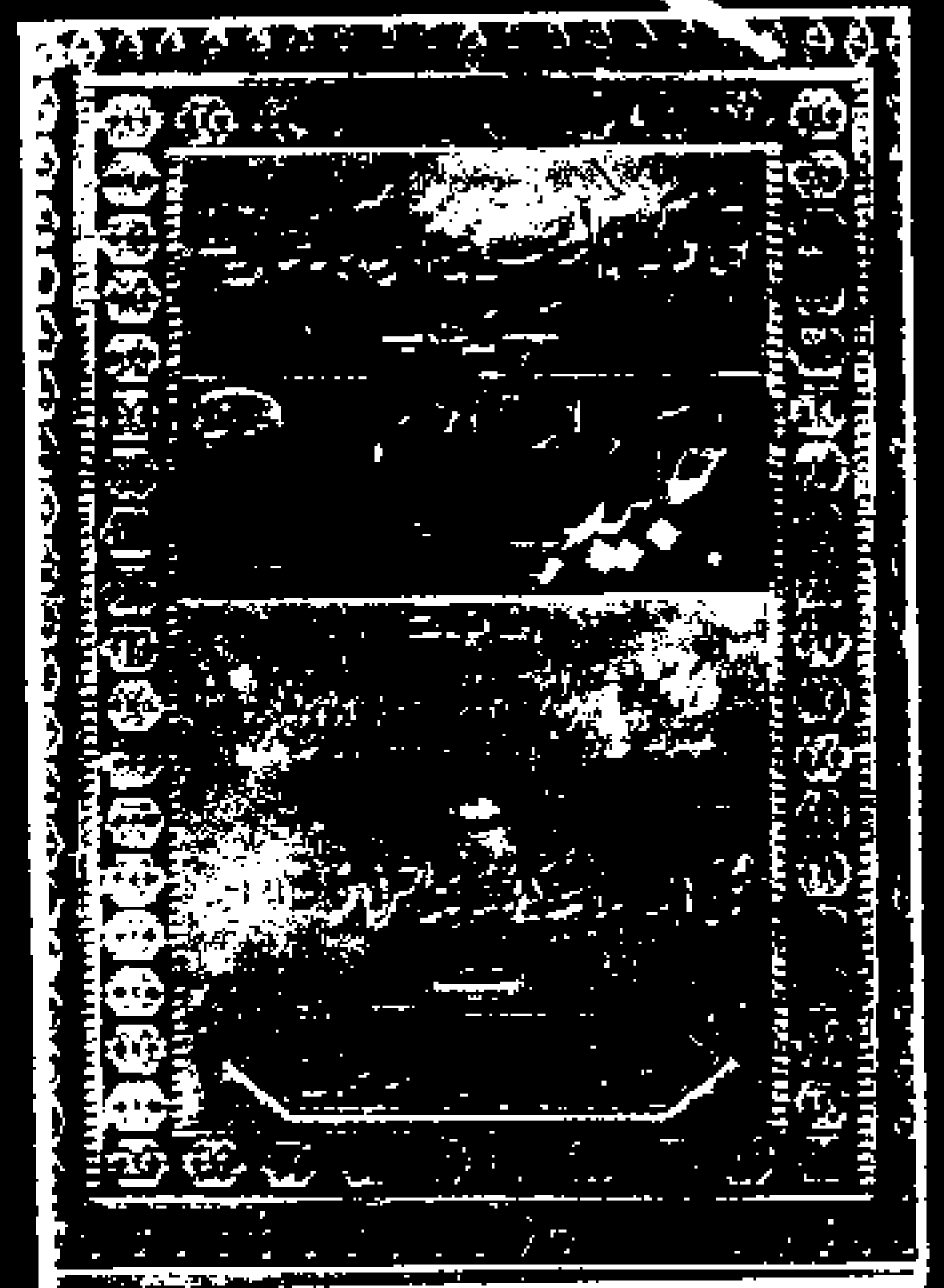

فتاویٰ بریلی شریف




فتاویٰ اجملیہ




فتاویٰ فیض الرسول
شبیر برادرز




شبیر
برادرز

شبیر برادرز